معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے فی شمارہ سات روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیلِ زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے. اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.
کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے.

جلد ۱۶۵ ماہ ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۰۰ء عدد ۳

فہرست مضامین

شذرات

بھارتیہ جنتا پارٹی کو ایک نظریاتی اور اصول پسند جماعت خیال کیا جاتا تھا، اس لئے اکثر لوگوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ اس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد بدعنوانی، کرپشن، رشوت اور لوٹ کھسوٹ میں کمی آجائے گی جرائم اور فسادات کی روک تھام ہوگی اور حالات پُرسکون اور معتدل رہیں گے، اقلیتیں اور پس ماندہ طبقہ کے لوگ امن چین سے زندگی گزاریں گے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا، خود بی۔ جے۔ پی نے بھی اسی دعویٰ کے ساتھ اقتدار سنبھالا تھا کہ وہ خوف و دہشت اور کرپشن سے پاک ایک صاف شفاف حکومت قائم کرے گی مگر آج ایک عام آدمی بھی محسوس کر رہا ہے کہ وہی بے اصولی وہی جوڑ توڑ جرائم اور بدعنوانیوں کی وہی حوصلہ افزائی، مخالفین کو پریشان کرنے، اپنی حکومت قائم کرنے اور اسے بچانے کے لئے وہی دھاندلی اور عیاری جس کو "کانگریس کلچر" کہہ کر اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا اب بھی جاری ہے، تشدد اور فسادات آج بھی ہندوستانی جمہوریت کی پہچان بنے ہوئے ہیں، ایک جنگل راج ختم کر کے دوسرا جنگل راج قائم کیا جا رہا ہے، کوئی اصلاح تو درکنار روز بروز حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں، ملک کی درخشاں روایات سچائی، عدمِ تشدد، رواداری، انصاف اور بھائی چارگی کو وہ لوگ پامال کر رہے ہیں جو اپنے کو بھارتیہ سنسکرتی اور کلچر کا ٹھیکے دار کہتے ہیں۔

مسلم دشمنی تو اس پارٹی کے خمیر میں داخل ہے، وہ مسلمانوں کی شناخت اور تشخص کو مٹانے، ان کو ان کے عقیدہ و مذہب سے برگشتہ کرنے اور انہیں ذہنی و دماغی اذیت پہنچانے کے نت نئے طریقے اختیار کر رہی ہے، حالانکہ وزیرِ اعظم نے لوک سبھا کے انتخابی جلسوں میں بار بار کہا تھا کہ مسلمان بھارتیہ جنتا پارٹی کا خوف دل سے نکال دیں اور ایک بار اس کو بھی آزمائیں، لیکن جو اقدامات کئے جا رہے ہیں ان کے پس پردہ مسلم دشمنی کارفرما ہوتی ہے، نظامِ تعلیم کو مخصوص رنگ دینے، ایک خاص طرزِ فکر کے لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ لکھنے پر مامور کرنے، مخصوص ذہنیت کے لوگوں کو کلیدی اور اہم جگہوں پر فائز کرنے، سرکاری ملازموں کو آر۔ ایس۔ ایس کی

شاکھاؤں میں شرکت کی اجازت دینے اور دستورِ ہند میں ردوبدل کے لئے کمیٹی مقرر کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ملک کے جمہوری ڈھانچے اور سیکولر تانے بانے کو درہم برہم کر کے اقلیتوں کو پریشان کیا جائے اور ان کے آئینی اور جمہوری حقوق سلب کر لئے جائیں۔

حال ہی میں اترپردیش حکومت نے مذہبی مقامات و عمارات کا جو بل منظور کیا ہے گو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق تمام مذاہب سے ہے مگر خود حکومت کے ذمہ داروں کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ بل کا اصل مقصد مسلمان ہی ہیں، حکومت ان کی مذہبی سرگرمیوں پر بندش لگا کر اور دینی مدارس کو غیر موثر بنا کر مسلمانوں کے دستوری اور جمہوری حقوق کو چھین لینا چاہتی ہے، اسی لئے اترپردیش کے سارے مسلمان اس کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں اور ہر طبقہ و مسلک کے لوگ اس سے بے چین اور بے قرار ہو گئے ہیں جس کا اندازہ اردو اخباروں سے پہلے ہی سے ہو رہا تھا اور اب ۵ مارچ کو جمعیۃ علمائے ہند کے زیرِ اہتمام لکھنؤ میں ہونے والے تحفظ مذہبی حقوق کنونشن نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ اس معاملے میں تمام مسلمان متحد ہیں اور وہ بل کی واپسی تک اپنی جد و جہد بھی جاری رکھیں گے اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی بھی دیں گے۔ ان کی تعداد، ان کا جوش و خروش اور عزم و حوصلہ دیکھ کر حکومت بھی چیں بہ جبیں ہو گئی ہے اور اس کے ایک وزیر نے تحریکِ آزادی کے ہراول دستہ میں شامل لوگوں کو "غدار" کا خطاب مرحمت کیا ہے، یہ خطاب تو ان کو زیب دیتا ہے جو ملک کے مختلف فرقوں میں نفرت اور اشتعال بڑھا رہے ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو درہم برہم کر رہے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کے کنوینر جناب زیڈ کے فیضان نے تین رکنی وفد کے ساتھ یونیورسٹی کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بیان دیا ہے "چونکہ موجودہ وائس چانسلر کے عہدے کی مدت ۳۰ اپریل کو ختم ہو رہی ہے، اس لئے نئے وائس چانسلر کے انتخاب کی کارروائی فوری طور پر شروع کرنے کے لئے یونیورسٹی ایکزیکیٹیو کمیٹی اور کورٹ کی میٹنگ بلا تاخیر بلائی جائے۔ ساتھ ہی کورٹ کی

میٹنگ سے پہلے طلبہ کی اس میں نمایندگی دینے اور کورٹ کی خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لئے یونین اور فیکلٹیز کے الکشن کرائے جائیں"۔ ہم اس کی پُرزور تائید کرتے ہیں، موجودہ وائس چانسلر کے دور میں گو کچھ تعمیری کام بھی ہوئے مگر وہ اپنے غیر جمہوری اور آمرانہ رویے کی وجہ سے یونیورسٹی حلقے میں پسند نہیں کئے جاتے ہیں، ان کے دور میں تشدد کے متعدد واقعات ہوئے، کئی بار یونیورسٹی بند ہوئی اور بعض طلبہ مارے گئے، اس لئے نئے وائس چانسلر کا انتخاب جلد عمل میں آنا ضروری ہے۔

اعظم گڈھ کے فساد کی حقیقت جاننے اور دارالمصنفین کے کارکنوں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے ہمارے پاس متعدد خطوط آرہے ہیں۔ طلبہ کے ہنگامے ہر کالج کی طرح شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج میں بھی ہوتے رہتے تھے مگر کبھی اس کی چہار دیواری سے آگے نہیں بڑھتے تھے، اس دفعہ کا ہنگامہ اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کی فرقہ پرستوں سے سازباز کا نتیجہ تھا، ۲۶؍ جنوری کو کالج کے بعض ہندو طلبہ نے یوم جمہوریہ کے جلسے میں وندے ماترم پڑھنے کے لئے اصرار کیا، اجازت نہ دینے پر وہ ۲۷؍ جنوری کو شہر اور ضلع کے کئی کالجوں کے طلبہ اور شرپسندوں کے ساتھ آکر گھنٹوں شبلی کالج میں توڑ پھوڑ اور زد وکوب کرتے رہے، ان کا ایک گروہ دارالمصنفین کا بند پھاٹک توڑ کر اندر گھس آیا اور کتب خانے اور دوسری عمارتوں کے شیشے اور دروازے توڑے، کتب خانے کو جلانے کی کوشش بھی کی، بعض ملازموں کی سائیکلیں اٹھالے گئے، یہاں موجود شبلی کالج کے شعبۂ تاریخ کے صدر ڈاکٹر جاوید علی جو دارالمصنفین کے اعزازی رفیق بھی ہیں شورش پسندوں کو سمجھانے اور روکنے گئے تو انہیں لہولہان کر دیا، اب وہ روبصحت ہیں، دونوں جگہ توڑ پھوڑ کے دوران بار بار پولیس اور انتظامیہ کو فون سے اطلاع دی گئی مگر وہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد آئی، ۲۷؍ جنوری کو مسلمانوں کی بعض دکانیں لوٹی اور جلائی گئیں جس کا سلسلہ کرفیو کے بعد بھی جاری رہا، بعض مسجدوں کی بے حرمتی بھی کی گئی، زیادہ تر مسلم طلبہ اور بے قصور مسلمانوں کی گرفتاری ہوئی اور انہیں اذیت بھی دی گئی۔ ان سطروں کی تحریر کے وقت ہائی کورٹ سے ان کی ضمانت کی اطلاع آئی۔

مقالات

قدیم مصر اور آثار فراعنہ پر ایک نظر

از

مولانا محمد شہاب الدین ندوی *

تاریخ عالم میں مصر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کی تہذیب قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ دینی و شرعی حیثیت سے بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ وہی ملک ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مسکن رہا ہے اور بنی اسرائیل کا اس ملک سے خاص تعلق تھا جنھوں نے یہاں پر بہت سے مصائب جھیلے، خصوصاً فرعون موسیٰ یعنی رعمسیس ثانی کے دور میں ان کا جینا حرام ہوگیا تھا۔ کیونکہ وہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کرا دیتا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون اور بنی اسرائیل کا تذکرہ جتنی تفصیل کے ساتھ ہے اتنا تفصیلی تذکرہ کسی اور پیغمبر یا کسی اور قوم کا نہیں ہے۔ راقم السطور قرآنیات کا ایک طالب علم ہے، اس لئے ایک عرصے سے خواہش تھی کہ اس ملک کو قریب سے دیکھا جائے اور ان مقامات کا مشاہدہ کیا جائے جن کا تعلق قرآن حکیم سے ہے۔ خوش قسمتی سے اس کا موقع ۱۹۹۸ء اور ۱۹۹۹ء میں ملا اور مصر کے دو سفر ہوگئے جو مصر کی مجلس اعلیٰ برائے اسلامی امور (المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ) کی جانب سے بلائی گئی دو سالانہ کانفرنسوں میں شرکت کی غرض سے تھے۔ یہ مجلس مصر کی وزارت اوقاف کے ماتحت ہے۔ ان

---

* ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ و چیرمین دارالشریعہ، بنگلور ۲۹۔

دو کانفرنسوں میں راقم سطور نے ایک سرکاری مہمان اور مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اور دونوں میں اپنے مقالات عربی زبان میں پیش کئے۔

مصریوں کی ایک کوتاہی

ہر ایک کانفرنس کے بعد مصر میں مزید ایک ایک ہفتہ قیام کرنے اور یہاں کے بعض تاریخی اور ثقافتی مقامات دیکھنے کا موقع ملا۔ قاہرہ شہر اور اس کی موجودہ تہذیب کو قریب سے دیکھنے کے علاوہ مصر کے قدیم اور تاریخی شہر اسکندریہ کی بھی سیر کی۔ مگر افسوس ہے کہ فراعنہ مصر کا اصل گڑھ اقصر (جس کا قدیم نام تھبس تھا) دیکھنے سے محرومی رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانے کا ایک "قصہ" ہونے کی وجہ سے آج کل کے علمی حلقوں میں اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رہی ہے۔ اگرچہ موجودہ مصریوں کی اکثریت فرعون کو ایک قومی ہیرو تصور کرتی اور قدیم مصری تہذیب وتمدن پر فخر کرتی ہے۔ مگر قرآنی نقطۂ نظر سے فرعون کے قصے اور اس کے گڑھ کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو اصلاً مطلوب ہے اور اس بنا پر آج فرعون مشہور ہوتے ہوئے بھی گویا کہ مجہول ہے۔ عربی زبان میں مجھے اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں مل سکی اور نہ ہی جدید مصر کی تاریخ پر باوجود کوشش بسیار کے کوئی کتاب دستیاب ہوسکی۔ صرف سیاحوں کے لئے بعض گائیڈ بکس انگریزی اور بعض دیگر مغربی زبانوں میں ملتی ہیں۔ میں نے ایسے دو گائیڈ بکس خرید لئے تھے۔ جن کے تفصیلی مطالعے کا موقع مجھے اپنے دوسرے سفر کے بعد ملا۔ ان میں فرعون کے اصل مقام اور وہاں پر موجود اس کے آثار وباقیات کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اگر اپنے دوسرے سفر سے پہلے اس کی واقفیت ہوجاتی تو میں کچھ وقت نکال کر ان مقامات کا مشاہدہ ضرور کرتا۔ بہر حال ان گائیڈوں اور بعض دیگر تاریخی ماخذوں کی مدد سے حسب ذیل معلوماتی مضمون تحریر کر رہا ہوں جس میں کچھ جغرافیائی معلومات اور کچھ تاریخی واقعات کے علاوہ مصر کی پوری قدیم تاریخ ایک نظر میں آگئی ہے اور جہاں تک ہوسکا میں نے اس داستان کو مختصر کرنے کی کوشش کی ہے اور میرے

پیش نظر اس سے مقصود قرآن عظیم کے بعض حقایق اور اس کے اعجاز کو نمایاں کرنا ہے اور اس کا تعلق ارض القرآن سے بہت گہرا ہے۔

راقم سطور نے اس سلسلے میں دو مزید مضامین تحریر کئے ہیں جو یہ ہیں: (۱) قاہرہ کانفرنس کی مفصل رپورٹ (۲) سفرنامۂ مصر۔ پہلا مضمون چھپ گیا ہے اور پیش نظر مضمون "سفرنامۂ مصر" کا مقدمہ ہے۔

مصر کا محل وقوع اور اس کی اہمیت

ملک مصر مشرق ومغرب کا سنگم کہلاتا ہے کیونکہ یہ مغربی ممالک کے لئے مشرق کا دروازہ ہے اور یہ واحد ملک ہے جو ایشیا اور افریقہ دو براعظموں میں واقع ہے۔ چنانچہ اس کا مشرقی حصہ (سینا) ایشیا میں اور بقیہ ملک افریقہ میں پڑتا ہے۔ اس کے شمال میں بحیرۂ روم اور مشرق میں بحر قلزم واقع ہے۔ مغرب میں اس کی سرحدیں لیبیا سے اور جنوب میں سوڈان سے ملتی ہیں۔ اس ملک کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ بحیرۂ روم (بحر ابیض متوسط) کو بحر قلزم سے ملانے والی مشہور آبی شاہراہ نہر سوئز بھی اسی ملک سے ہوکر گزرتی ہے۔ اس اعتبار سے مصر صرف مختلف تہذیبوں کا سنگم ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑی تجارتی گزرگاہ بھی ہے۔ نہر سوئز کی وجہ سے برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان کا فاصلہ ۹۷۰۰ کیلو میٹر کم ہوگیا ہے۔ جب کہ پہلے یورپ سے ایشیا پہنچنے کے لئے جہازوں کو افریقہ کا ایک پورا چکر لگانا پڑتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ایک مصروف ترین آبی گزرگاہ ہے۔ جہاں سے روزانہ بے شمار جہاز اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گزرتے ہیں۔ ان جہازوں کو گزرنے کے لئے ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے جو مصر کی قومی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔

دریائے نیل کی اہمیت

مصر کی آبادی، اس کی چہل پہل، اس کی تہذیب وتمدن اور اس کی ساری رونق وخوبصورتی دریائے نیل کی بدولت ہے۔ اگر نیل نہ ہوتا تو یہ ملک پورے کا پورا

ریگستان و بیابان ہوتا جو حقیقتاً بحر احمر سے لے کر ریگ زار لیبیا تک لق و دق صحرا ہی ہے۔ نقشے میں دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ریگستان کے درمیان ایک پتلی سی لکیر جیسی ہری بھری پٹی نکل آئی ہے جو دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ البتہ قاہرہ سے اسکندریہ تک یہ سبز پٹی ڈیلٹا میں بدل گئی ہے۔ اس سبز پٹی کے دونوں طرف ریگ زار ہی ریگ زار ہیں۔

مصر کا رقبہ دس لاکھ مربع کیلو میٹر ہے جب کہ اس کا ۹۶ فی صد علاقہ ریگستان پر مشتمل ہے اور مصر کے تقریباً تمام قابل ذکر شہر اور آبادیاں دریائے نیل کے کنارے واقع ہیں۔ دریائے نیل "مسی سی پی" کے بعد دنیا کا دوسرا سب سے بڑا دریا ہے، جو چار ہزار میل (تقریباً ساڑھے چھ ہزار کیلو میٹر) لمبا ہے۔ اس کی بدولت نہ صرف ایک معتد بہ علاقہ قابل کاشت بن گیا ہے بلکہ مصریوں کے لئے پینے کا پانی بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ دریا اہل مصر کے لئے ریڑھ کی ہڈی جیسا اور ان کی زراعت و معیشت کا واحد مصدر ہے اور اسی بنا پر ان کی خوش حالی بھی برقرار ہے۔

قدیم مصر اور فراعنہ مصر کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ جس کا آغاز کم و بیش تین ہزار سال قبل مسیح سے ہوتا ہے۔ یہاں پر جن بادشاہوں نے حکومت کی وہ متعدد خاندانوں میں[5] بٹے ہوئے تھے، جنھوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ چنانچہ ان کی تعداد بعض مراجع میں ۳۰، بعض میں ۳۱ اور بعض میں اس سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے۔ اس سلسلے کا پہلا خاندان ۲۸۵۰ ق م میں سریر آرائے سلطنت ہوا اور پندرہویں صدی قبل مسیح میں ان کے اٹھارویں خاندان کے بادشاہوں نے اپنے لئے "فرعون" (PHARAOH) لقب اختیار کیا۔ یہ لفظ یونانی زبان کا ہے، جس کے اصل معنی "بڑے گھر" کے ہیں اور یہ شاہی محل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مگر اس سلسلے کے بادشاہوں نے خود اپنے لئے یہ لقب اختیار کر لیا۔ پھر ان کے

بعد کے بادشاہوں نے بھی اپنے آپ کو اسی لقب سے موسوم کیا۔ لیکن عرف عام میں اس نسل کے تمام بادشاہوں کو (پہلے خاندان سے لے کر آخری خاندان تک) فرعون ہی کہا جاتا ہے[6]۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جس فرعون نے مصر پر حکومت کی تھی وہ اگرچہ عرف عام کے مطابق فرعون تھا مگر اس کا اصل نام "رمسیس ثانی" (RAMSES II) تھا اور اس کا دور حکومت متعدد مراجع میں ۱۳۰۴ ۔ ۱۲۳۷ ق م بتایا جاتا ہے[7] جب کہ بعض دیگر مراجع میں اس بارے میں کچھ اختلاف بھی ہے اور اس کا تعلق انیسویں خاندان سے تھا۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

فراعنہ (واحد فرعون) کے ۳۱ ویں خاندان کا خاتمہ سکندر اعظم کے ہاتھوں ۳۳۲ ق م میں ہوا۔ اس فتح کے بعد اس نے شہر اسکندریہ کی بنیاد رکھی جو آج مصر کا دوسرا سب سے بڑا شہر، ایک تجارتی و ثقافتی مرکز اور مصر کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔

مصر کچھ عرصے تک فارسی ولایت کے ماتحت بھی رہا اور اسی طرح وہ اشوریوں کے زیر نگیں بھی آیا۔ پھر یہاں پر ۵۰ ۔ ۳۰ ق م مشہور مصری ملکہ قلوپطرہ نے بھی حکومت کی۔ اسلامی دور سے پہلے یہاں قبطیوں کی حکومت تھی اور ان کا بادشاہ مقوقس تھا۔ قبطی مصر کے قدیم باشندے تھے جنھوں نے رومی دور میں مسیحیت اختیار کر لی تھی۔ مگر اسلامی دور میں ان کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اب تھوڑے سے مسیحی جو مصر میں باقی رہ گئے ہیں وہ اصلاً قبطی ہیں اور ان کا مرکز اسکندریہ ہے۔ ان کے موجودہ بطریق "باباشنودہ ثالث" ہیں۔ کانفرنس کے موقع پر راقم سطور نے ان سے ملاقات کر کے انہیں اپنی ایک انگریزی کتاب پیش کی، جسے انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔

مصر کی فتح خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب کی اجازت سے حضرت عمرو بن العاص نے

۱۸ یا ۱۹ھ (۶۳۹ء) میں مصر پر فوج کشی کی اور ۲۱ھ (۶۴۲ء) میں پورا ملک فتح ہوگیا۔ یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ مصر کا پہلا شہر جو اسلام کی عمل داری میں آیا وہ "فرما" تھا۔ پھر "ام دنین" اور اس کے بعد "قلعہ" فتح کیا گیا۔ یاقوت حموی نے جس قلعہ کا تذکرہ کیا ہے وہ "بابلیون" یا (BABYLON) تھا، جس کو حضرت عمرو بن العاص نے ۶۴۱ء میں فتح کرکے اس کے قریب ہی ایک نیا شہر "فسطاط" کے نام سے بسایا تھا۔ فسطاط عربی میں خیمے کو کہتے ہیں۔ چونکہ حضرت عمرو نے اس جنگ کے موقع پر اپنا خیمہ یہیں نصب کیا تھا اس لئے یہی اس شہر کا نام بھی پڑ گیا اور یہ شہر موجودہ قاہرہ میں ضم ہوگیا ہے جو اب قدیم شہر کا ایک حصہ ہے اور ٹھیک اسی مقام پر آج جامع عمرو بن العاص ہے جو مصر کی اولین مسجد ہے۔ یہاں پر پہنچنے کے لئے اب میٹرو ریلوے کے ذریعہ "مارگرگس" نامی ریلوے اسٹیشن پر اترنا پڑتا ہے۔ نیز بابلیون بھی اب قاہرہ شہر کا ایک محلہ بن چکا ہے۔

اسلام کی مقبولیت کی اصل وجہ ۲۱ھ میں اسکندریہ کی فتح کے ساتھ ہی پورا مصر اسلام کے زیر سایہ آگیا۔ یہاں کا بادشاہ مقوقس اور یہاں کے اصل باشندے چونکہ قبطی تھے جو رومی (عیسائی) سلطنت کے ظلم و جور سے نالاں تھے، اس لئے انہوں نے اسلامی فوجوں کا ساتھ مکمل طور پر دیا اور مصر کی فتح میں بہت مدد کی۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہئے چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر و کسریٰ اور مقوقس کو خطوط کے ذریعہ اسلام کی دعوت دے کر ان پر گویا کہ حجت پوری کردی تھی اس لئے ان کے جور و ستم سے ان ممالک کی رعایا کو آزاد کرانے اور انہیں راہ مستقیم دکھانے نیز انہیں اسلامی عدل و انصاف سے براہ راست روشناس کرانے کی غرض سے صحابۂ کرام نے منشائے نبوی کے مطابق ان ممالک پر فوج کشی کی اور اس کے نتیجے میں ان ممالک کے

اکثر و بیشتر عیسائیوں اور دیگر قوموں نے اسلام قبول کرلیا۔ کیونکہ وہ اسلامی نظام کی خوبیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہر جگہ اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا اور اسلامی حکومت کو دل سے چاہنے لگے۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اسلام نہایت درجہ سرعت کے ساتھ پھیل گیا۔ مگر مخالفین اسلام اسے الٹی عینک سے دیکھتے ہوئے اسلام پر بزور شمشیر پھیلائے جانے کا الزام عائد کرتے ہیں۔

مصر کی چار تہذیبیں مملکت مصر کو زمانہ حال تک چار تہذیبوں سے واسطہ پڑا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ قدیم مصری یا دور فراعنہ کی تہذیب جو لگ بھگ ۵۳ صدیوں تک رہی۔

۲۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم کی فتح مصر کے بعد کی رومی تہذیب جو ایک ہزار سال تک رہی اور اس میں مسیحیت کا غلبہ رہا۔

۳۔ اسلامی تہذیب جو فتح مصر کے ساتھ ہی وجود میں آئی اور اس میں عربی زبان اور ادب غالب آگئے۔

۴۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے یہاں پر مغربی تہذیب کا غلبہ ہوگیا جو ترکی بادشاہ محمد علی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

فراعنہ کا پایہ تخت چونکہ قاہرہ کی تاسیس دور اسلام میں ۳۵۸ھ (۹۶۷ء) میں ہوئی تھی، اس لئے مجھے فراعنہ کے اصل گڑھ کی تلاش تھی۔ مصر کے دوران قیام میں اتنا تو معلوم ہوچکا تھا کہ ان کا پایہ تخت "اقصر" تھا۔ مگر اس سلسلے میں کوئی تشفی بخش مواد سامنے نہیں آسکا تھا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ مصر کے مختصر قیام اور اس کی ہنگامی مصروفیات کے باعث اس کی تحقیق کا موقع ہی نہ مل سکا۔ مصر کے دوسرے سفر سے بعد جب میں نے اپنا سفرنامہ لکھنا

شروع کیا تو بعض کتابوں کی مراجعت کے بعد پتہ چلا کہ ان کے دو پائے تخت تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مصر کا قدیم پائے تخت ممفس (MEMHPES) تھا جو آج بھی شہر قاہرہ کے جنوب میں پندرہ میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہ شہر ۵۷۲۵–۲۱۳۰ ق م تک قدیم بادشاہوں یا عرف عام میں فرعونوں کا پایہ تخت رہا۔ یہ دریائے نیل کے مغربی کنارے پر ہے[۹] اور اس کے قریب "سقارہ" کے بعض اہرام موجود ہیں جو "اہرام جیزہ" سے چھوٹے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے اہرام بھی ہیں جو سب اسی علاقے میں ہیں۔

فراعنہ اور خاص کر فرعون اعظم (رمیسس ثانی) کا پائے تخت "تھبس" (THEBES) تھا، جہاں پر موجودہ شہر اقصر انگریزی میں (LUXOR) آباد ہے۔ یہ شہر دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر اسیوط اور اسوان کے درمیان قاہرہ سے ۴۱۹ میل (۶۷۰ کیلو میٹر) کے فاصلے پر جنوب میں پڑتا ہے اور اس کا عرض البلد ۲۶ ہے۔ تھبس کا رقبہ تقریباً چھ مربع میل تھا۔ اس شہر کا اکثر حصہ نیل کے مشرقی کنارے پر تھا اور اس کے مغربی کنارے پر "مردوں کا شہر" واقع تھا۔ یعنی مصری بادشاہوں کے وہ مندر جو "لاش گھروں" کے طور پر ہوا کرتے تھے اور اس علاقے میں مندروں کے پجاریوں، سپاہیوں، پیشہ وروں اور مز...ں کے مکان تھے[۸]۔ موجودہ شہر اقصر غالباً عربوں کا دیا ہوا نام معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یاقوت حموی کی تصریح کے مطابق لفظ اقصر قصر کی جمع قلت ہے، جو محل کے معنی میں ہے۔ چونکہ یہاں پر کئی ایک محل موجود ہیں اس لئے اس کا نام اقصر پڑ گیا[۹]۔

مصر کے افسانوی دور کے مطابق "ھورس" دیوتا اپنے بھائی "سیتھ" (SETH) کو شکست دے کر ایک متحدہ ملک کا بادشاہ بن گیا تھا۔ اس بنا پر اسے تمام فرعونوں کا مورث اعلیٰ

تصور کیا جاتا ہے[۱۰]۔

رمیسس ثانی RAMSES II کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون مانا جاتا ہے اس کا تعلق قدیم مصر کے ۱۹ ویں خاندان سے تھا اور اس کا دور حکومت ۱۲۹۰ تا ۱۲۲۳ ق م قرار دیا جاتا ہے جو قدیم مصر کی تاریخ میں دوسرے نمبر پر سب سے لمبا تھا۔ یعنی اس نے مصر پر ۶۷ سال تک حکمرانی کی[۱۱]۔

عظیم رمیسس ثانی نے اپنے دور حکومت کے پانچویں سال حتیوں سے جنگ کی اور اس نے اس پرخطر صورت حال کو اپنے ناخن تدبیر سے سلجھاتے ہوئے اپنے دور حکومت کے ۲۱ ویں سال حتیوں سے صلح کا معاہدہ کر لیا اور ایک حتی شہزادی سے شادی کر لی۔ اس کا دور حکومت قدیم مصری تاریخ میں ایک بلند مقام کی نشان دہی کرتا ہے، جس میں مضبوط و مستحکم عمارتیں بنانا بھی شامل تھا۔ مثال کے طور پر اس نے "ابو سمبل" میں دو چٹانی مندر بنائے اور "کرناک" میں "سیتی اول" کے ستونی چھت والے ایوان اور "ابیڈس" مندر کی تکمیل کی[۱۲]۔ فرعونی دور کے یہ آثار و باقیات آج اکثر و بیشتر ٹوٹی پھوٹی شکل میں موجود ہیں اور ان کی تصویریں بھی بعض گائیڈ بکس (مثلاً کتاب "دس از ایجپٹ") میں دیکھی جا سکتی ہیں اور اس کتاب میں رمیسس ثانی (فرعون موسیٰ) کے ایوان کی ایک عمدہ تصویر بھی موجود ہے جو دریائے نیل کے کنارے واقع ہے۔ آج کل اس کے بغل میں ایک مسجد بھی بنا دی گئی ہے[۱۳]۔

"را" دیوتا کا مظہر رمیسس ثانی نے "تھبس" میں "امون" دیوتا کا ایک مندر بھی بنوایا تھا۔ امون سورج کا نام ہے جو قدیم مصریوں کا ایک دیوتا تھا[۱۴]۔ اسی طرح اوسیرس (OSIRIS) بھی مصریوں کا ایک دیوتا تھا، جس کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت تھی[۱۵]۔ قدیم مصری سورج دیوتا کو "را" (RA یا "رے" (RE)) کے نام سے بھی جانتے تھے اور اسے "فرا"

(PHRH) بھی کہا گیا ہے جو خدائے خالق تھا۔

Re, also spelled Ra or Phrh, in ancient Egyptian religion, god of the sun and creator god.

اور اس اعتبار سے لفظ فرعون (PHARAOH) غالباً اسی لفظ Ra یا Phra سے مشتق معلوم ہوتا ہے جو سورج کا اوتار یا سورج کا بیٹا ہونے کے معنی میں ہو سکتا ہے اور اس بنا پر مصری لوگ فرعون کو بھی ایک دیوتا یا دیوتا زادہ تصور کرتے تھے۔ جس طرح کہ ہندوستان میں بعض راجہ اپنے آپ کو "سورج بنسی" یا "چندر بنسی" خاندان کا قرار دیتے ہوئے خود کو ایک مافوق الفطرت انسان یا دیوتا کا روپ باور کراتے تھے اور یہ سارا ڈھونگ اپنی رعایا کا استحصال عقیدے کے نام پر کرنے کی غرض سے تھا، تاکہ وہ خوشی خوشی ان کے ظلم و جور یا سختیوں کو جھیل سکیں اور ان میں بغاوت کا جذبہ پیدا نہ ہو سکے۔ مصریوں کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ فرعون آسمانی خدا "حورس" (HORUS) کا انسانی روپ ہے اور اس بنا پر وہ ملک کی ساری زمین کا مالک کہلاتا تھا اور اسے تمام انسانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل تھا۔[۱۱]

فرعون کا دعوائے خدائی اس اعتبار سے عوام کے نزدیک فراعنہ کا مقام خدا اور بندوں کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت رکھتا تھا جو انسانی مقام سے بہت اوپر تھا اور اس بنا پر انہیں بہت وسیع اختیارات حاصل تھے۔ یہ تھی وہ اصل بنیاد جس کی بنا پر فرعون خدائی کا دعویٰ کیا کرتا تھا اس پس منظر میں قرآن حکیم میں موجود حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور ان کا صحیح مفہوم واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں فرعون کے دعوے کچھ اس طرح کے تھے:

۱۔ کبھی وہ کہتا تھا کہ اس سرزمین میں میرے سوا اور کوئی خدا موجود نہیں ہے۔ یعنی میں

یہاں کا حاکم مطلق ہوں اور مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ یا میں کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ	اور فرعون نے کہا کہ اے سردارو! میں
مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي	نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی دوسرا
(قصص: ۳۸)	خدا ہے۔

۲۔ کبھی وہ کہتا کہ میں ہی سب سے بڑا خدا ہوں:

فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ۔	پھر اس نے کہا کہ میں تمہارا سب سے برتر
(نازعات: ۲۴)	خدا ہوں۔

۳۔ کبھی وہ کہتا تھا کہ آسمان میں کوئی خدا موجود نہیں ہے چنانچہ اس نے اس سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا قرار دے کر (کہ اللہ آسمان پر موجود ہے) آسمان پر پہنچنے کی سعی بھی کی اور اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ وہ اوپر پہنچنے کے لئے ایک بلند مینارہ تعمیر کرے تاکہ وہ آسمان پر پہنچ کر خدائے موسیٰؑ کا کام تمام کر سکے۔ معاذ اللہ۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَامَانُ ابْنِ لِي	اور فرعون نے کہا کہ اے ہامان میرے لئے
صَرْحًا لَّعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ أَسْبَابَ	ایک اونچا محل (یا مینارہ) بنا تاکہ میں
السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ	(اوپری) راستوں تک پہنچ سکوں، یعنی
وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا۔	آسمانی راستوں تک۔ پھر میں وہاں سے
(مومن: ۳۶-۳۷)	جھانک کر خدائے موسیٰ کو دیکھ سکوں۔
	مگر میں تو اسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں (فی الواقع
	ایسا کوئی خدا وہاں پر موجود نہیں ہے)

فرعون تین شکلوں میں بہر حال فرعون مشہور یا رمسیس ثانی آج بھی مصر میں تین شکلوں میں پایا جاتا ہے۔

۱۔ اس کا وہ مجسمہ جو ممفس (MEMHPIS) میں پایا گیا تھا۔ اب اسے قاہرہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے والے میدان (چوک) میں نصب کر دیا گیا ہے اور وہ یہاں پر ۱۹۵۴ء سے اب تک کھڑا ہوا ہے۔ اس جگہ کا نام "میدان رمسیس" رکھا گیا ہے اور یہ مجسمہ دس میٹر (۳۳ فٹ) اونچا ہے۔

۲۔ رمسیس ثانی کی وہ ممی (حنوط کی ہوئی لاش) جو قاہرہ میوزیم میں رکھی ہوئی ہے اور اسے دیکھ کر اس کی بے کسی کی تصویر عیاں ہو جاتی ہے۔

۳۔ بالائی (UPPER) مصر یا صعید مصر میں واقع اقصر شہر کے دوسری طرف (دریائے نیل کے اس پار) ایک شہر "گرناہ" میں رمسیس ثانی کا بنایا ہوا ایک مندر موجود ہے جو تدفین کی غرض سے بنایا گیا تھا اور یہ مصری بادشاہوں کا عام رواج تھا۔ اب اس مقام کا نام "رے سیم" (RAMESSEUM) رکھا گیا ہے۔ اس کے لفظی معنی "فرعون کی تدفین گاہ" کے ہیں۔ یہ مقام رمسیس ثانی کے ۵۷ فٹ (۱۷ میٹر) اونچے مجسمے کے لئے مشہور ہے جسے بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مگر اب مرور ایام کے باعث اس مجسمے کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے اور اس عمارت کی آدھی دیواریں ٹوٹ چکی ہیں [1]

غرض آج فرعون تین شکلوں میں پایا جاتا ہے: ایک کھڑے ہوئے، دوسرے بیٹھے ہوئے اور تیسرے لیٹے ہوئے اور اس کی یہ آخری شکل اس کے صحیح خدوخال کا منظر ہے اور اس کا یہ آخری منظر اس کی انتہائی بے چارگی کی ایک تصویر مجسم دکھائی دیتا ہے جو پوری دنیائے انسانیت کے لئے ایک عبرت انگیز نظر پیش کرتا ہے۔ کہاں وہ خدائی کا دعویدار اور کہاں اس کی یہ لاش جو ایک

لاغر اور نحیف شکل میں ایک تابوت کے اندر بند ہے۔ چنانچہ قرآن عظیم نے اس بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ آج ایک زندہ معجزہ نظر آرہا ہے:

اَلْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ آیَةً۔ (یونس: ۹۲)

آج ہم تیری لاش کو (پانی میں ڈوبنے سے) بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے عبرت بن سکے۔

راقم سطور نے "میدان رمسیس" پہنچ کر فرعونی مجسمے کا بھی مشاہدہ کیا۔ اس مجسمے کے مطابق اس کا چہرہ بھرا بھرا اور جسم ہٹا کٹا سا لگتا ہے۔ گویا کہ وہ ایک مکمل نوجوان کے روپ میں ہے۔ چنانچہ اس کے سامنے کچھ دیر کھڑے ہو کر اسے تکتا رہا۔ اس موقع پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی اور مجھے رہ رہ کر محسوس ہو رہا تھا گویا خود فرعون مجھ سے مخاطب ہے اور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اچھا جناب آپ ہی وہ ذات شریف ہیں جنہوں نے خدائی کا دعوی کر کے ایک مخلوق کو گمراہ اور مبتلائے عذاب کر دیا تھا؟ بہر حال آج اس کا مجسمہ اور اس کی ممی دونوں دنیا کے لئے نشان عبرت بنے ہوئے ہیں۔ گویا کہ وہ اپنی زبان حال سے یہ کہہ رہے ہوں۔

ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔ (رحمن: ۲۶-۲۷)

زمین پر جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے اور تیرے رب کی ذات ہی باقی رہے گی جو بڑی شان اور عظمت والی ہے۔

ایک دوسرا قرآنی اعجاز جیسا کہ اوپر بتایا گیا قدیم مصر پر جن بادشاہوں نے حکومت کی تھی وہ متعدد خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان کا دور تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ جدید تحقیقات کے مطابق ان کے اٹھارویں خاندان نے پندرہویں صدی قبل مسیح

میں اپنے لیے "فرعون" کا لقب اختیار کیا تھا۔ رمسیس ثانی کا تعلق ان کے بعد والے (انیسویں) خاندان سے ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیش رو تھے ان کے دور کا تعین نہیں ہو سکا۔ مگر وہ غالباً اٹھارویں خاندان سے پہلے کے کسی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ اور اس بنا پر ان کا لقب فرعون نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ عمومی طور پر سابقہ تمام بادشاہوں کو بھی فرعون ہی کہا گیا ہے اور خود موجودہ تورات (عہد نامہ قدیم) میں دور یوسف کے بادشاہ کو بھی فرعون ہی کہا گیا ہے[۱۹]۔ مگر قرآن حکیم کا اعجاز ملاحظہ ہو کر اس نے اس تاریخی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے دور یوسف کے بادشاہ کو فرعون نہیں بلکہ صرف "بادشاہ" کہا ہے:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖ۔	اور بادشاہ نے کہا کہ اسے (یوسف کو)
(یوسف: ۵)	میرے پاس لے آؤ۔

دیکھیے قرآن عظیم کی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی! یہ قرآن کا ایک دوسرا تاریخی اعجاز ہے جو ایک نبی امی کے ذریعہ بھیجا ہوا کلام ہے اور اس قسم کے علمی حقائق اور تاریخی نکات سے کلام الٰہی بھرا ہوا ہے جو بائبل کی اصلاح اور اس کی غلطیوں (تحریفات) کی تصحیح کرنے والا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بائبل اور قرآن میں خود سورۂ یوسف کے قصے میں جو فرق و اختلاف ہے اس کے مطالعے سے بھی قرآن عظیم کی عظمت و برتری صاف دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں مذکور ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے مصری بادشاہ کے خواب کی تعبیر بیان کی تو اس نے خوش ہو کر حضرت یوسف کو مصر کا حاکم بنا دیا۔

"پھر فرعون نے یوسف سے کہا کہ دیکھ میں نے تجھے ساری زمین مصر پر حکومت بخشی"[۲۰]

اور دوسری جگہ مذکور ہے "اور اس نے اسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا"[۲۱]

حالانکہ قرآن عظیم کی تصریح کے مطابق آپ کو صرف زمین کے "خزانوں" یا "پیداوار" کا انچارج بنایا گیا تھا، نہ کہ مصر کا حاکم یا بادشاہ۔ چنانچہ دیکھیے یہ واقعہ قرآن میں کس طرح آیا ہے:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ قَالَ اجْعَلْنِي عَلٰى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ (یوسف: ۵۴-۵۶)	بادشاہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لے آؤ تاکہ اسے خاص اپنے پاس رکھوں۔ پھر جب اس نے یوسف سے بات کی تو کہا کہ آج سے تو ہمارے یہاں معزز اور معتبر ہے۔ یوسف نے کہا کہ تو مجھے زمین کے خزانوں پر مامور کر دے، میں اس سلسلے میں (پیداوار کی) حفاظت کرنے والا اور واقف کار ہوں اور ہم نے اس طرح یوسف کو اس ملک میں با اختیار بنا دیا کہ وہ اس میں جہاں چاہے رہے۔ ہم جس کو چاہیں اپنی رحمت پہنچائیں۔ ہم نیکو کاروں کا اجر ضایع نہیں کرتے۔

اس اعتبار سے حضرت یوسف علیہ السلام کو زیادہ سے زیادہ "وزیر غذا" کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ عہدہ انہیں خود ان کی اپنی درخواست پر ملا تھا نہ کہ بادشاہ کے حکم سے اور اس اعتبار سے بائبل اور قرآن کے بیانات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن اس کے باوجود مستشرقین کو خوش فہمی بلکہ زعم ہے کہ قرآن بائبل سے ماخوذ ہے۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔

فرعونی دور کے آثار و مظاہر جیسا کہ عرض کیا گیا مصر کے قدیم بادشاہوں یا عرف عام میں فراعنہ کے دو پائے تخت ایک ممفس اور دوسرے تھبس۔ ممفس کے آس پاس زیادہ تر اہرام پائے جاتے ہیں جو فراعنہ کا پہلا صدر مقام تھا اور ان کا اصل گڑھ تھبس تھا۔ جہاں پر آج موجود

شہر اقصر واقع ہے۔ اس کے اطراف واکناف میں کئی شہر موجود ہیں جو سب کے سب دریائے نیل کے کنارے آباد ہیں۔ جیسے کرنک (KARNAK)، گرنا (GURNAH)، مدینت ہابو (MADINET HABU)، اسنا (ESNA)، کلاب شا (KALABSHA)، ادفو (EDFU)، کوم امبو (KOM AMBO)، فلے (FHILAE) اور ابو سمبل (ABU SIMBEL) وغیرہ۔ کچھ بستیاں مٹ چکی ہیں اور ان کی کچھ یادگاریں اور فرعونی دور کی عظیم الشان عمارتوں اور مندروں کے کھنڈرات یا شکستہ عمارتیں آج بھی موجود ہیں جو اپنے بنانے والوں کی عظمت کی یاد دلاتی ہیں۔ اور یہ پورا علاقہ فرعونی دور کے آثار و مظاہر سے پٹا ہوا ہے۔ ہر جگہ بڑے بڑے حجری ستونوں کا استعمال کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر ایسے عظیم ستون بنائے گئے ہیں جو بالکل عجوبۂ روزگار معلوم ہوتے ہیں۔ اس قدر عظیم ستونوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرکے انہیں نصب کرنا فرعونی دور کی انجینئرنگ کا بہت بڑا کمال ہے۔

کرنک مندر: چنانچہ ایسا ہی ایک مقام کرنک کا مندر قرار دیا گیا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس مندر کے دالان کے لئے جو ستون بنائے گئے ہیں وہ ۷۰ فٹ اونچے ہیں اور ان ستونوں کا اوپری حصہ اس قدر وسیع ہے کہ ہر ایک کے اوپر سو (۱۰۰) آدمی چمٹ کر کھڑے ہو سکتے ہیں اور اس مندر میں فرعونوں کے دیوپیکر مجسمے بھی ایستادہ ہیں۔ چنانچہ بعض مورخین نے اسے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ قرار دیا ہے۔[۲۲]

ابو سمبل کا مندر: اسی طرح اسوان سے ۳۲۰ کیلومیٹر دور بمقام ابو سمبل فرعون اعظم یعنی ریمسیس ثانی کا بنایا ہوا ایک عظیم اور دیوہیکل مندر بھی موجود ہے جو "امون-را" (AMON-RA) کی طرف منسوب ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ ۳۸ میٹر چوڑا اور ۶۵ میٹر لمبا ہے جو ایک بڑی چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ اس مندر کے سامنے والے حصے میں

چار (۲۰) عظیم الجثہ فرعون کو تخت پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک بیس میٹر اونچا ہے اور یہ سب ایک ہی شکل وصورت کے ہیں، جو فنی اعتبار سے ایک بہت بڑا کمال ہے۔ ان چاروں کے درمیان اندر جانے کے لئے دروازہ بنایا گیا ہے۔ ان مجسموں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ تراشا گیا ہے اور اس چٹانی عمارت کا بیرونی منظر بھی بڑا جاذب نظر ہے۔ ہاں البتہ ان چاروں فرعونوں میں سے ایک کا اوپری حصہ اب بالکل ٹوٹ چکا ہے۔

اس جگہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ہر سال ۲۱ر مارچ اور ۲۱ر ستمبر کو دونوں مرتبہ پانچ بج کر اٹھاون منٹ پر سورج کی ایک کرن اس ۶۵ میٹر لمبی عمارت میں داخل ہوکر "امون-را" اور ریمسیس ثانی کو روشنی کا غسل دیتی ہے اور پھر چند منٹوں بعد یہ کرن "ہرمکس" (مصریوں کے ایک اور دیوتا) پر پڑتی ہے۔ پھر تقریباً بیس (۲۰) منٹ کے بعد وہ غائب ہو جاتی ہے۔[۲۳]

سنگی مجسمے اور نقش و نگار: فرعونی دور کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر جگہ انواع واقسام کے بتوں اور سنگی مجسموں کی بھرمار نظر آتی ہے۔ بعض مقامات پر یہ بت اس قدر اونچے اور دیوپیکر ہیں کہ ان کی لمبائی اسّی۔ نوّے فٹ ہے اور وزن ہر ایک کا لگ بھگ ایک ہزار ٹن ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ وہ سالم ایک ہی پتھر سے تراشے ہوئے ہیں۔ اس قدر بڑے بتوں کو تراشنا اور ان کے چہرے مہرے اور خدوخال کی موزونیت کے لحاظ سے انہیں جاذب نظر بنانا فرعونی دور کی فنکاری کی ایک منھ بولتی تصویر ہے۔

اس دور کے بعض نسبتاً ہلکے بت اور مجسمے قاہرہ میوزیم میں بھی نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب فنی اعتبار سے انتہائی نفیس اور محیر العقول ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر اعلیٰ درجے کی مصوری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ان آثار و باقیات کو دیکھ کر فرعونی دور کی ایک پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جنھوں نے اس قطعۂ ارضی پر نہایت جاہ وجلال کے ساتھ حکومت کی اور اپنے

پیچھے تمدنی عجائب کے ایسے نقوش چھوڑ گئے جن میں دیدۂ بینا کے لئے بہت سے اسباق و بصائر موجود ہیں۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ	انہوں نے کتنے ہی باغات، چشمے، کھیتیاں
وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ	اور عمدہ مقامات اپنے پیچھے چھوڑ دئے!
كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ	اور وہ نعمتیں جن میں وہ مزے کیا کرتے
وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ فَمَا	تھے! (ہمارا قانون) اسی طرح ہوا کرتا ہے
بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ	(پھر) ہم نے ان چیزوں کا وارث دوسری
وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ۔	قوم کو بنا دیا پھر ان کی اس تباہی پہ نہ آسمان
(دخان: ۲۶-۲۹)	ہی رویا اور نہ زمین اور نہ ان کو کسی طرح
	کی مہلت ہی دی گئی۔

فرعونیات اور مصر جدید

موجودہ اہل مصر فرعونی دور کے تمدن اور ان کے آثار و مظاہر کی حفاظت کا حد درجہ اہتمام کرتے ہوئے ان کی نمائش سے خوب پیسے بٹورتے ہیں۔ بیرونی ممالک اور خاص کر یورپ اور امریکہ کے سیاحوں کا ایک ہجوم ہے جو ہر دن ہزاروں کی تعداد میں چلا آتا ہے۔ چنانچہ جب ہم قاہرہ میوزیم دیکھنے گئے تو اس کی وسیع عمارت کی دونوں منزلیں جو بے شمار ہالوں پر مشتمل ہیں سیاحوں سے بھرے ہوئے تھے اور چلنے کے لئے جگہ نہیں مل رہی تھی۔ واضح ہے کہ مصر کی قومی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ سیاحت یا ٹورازم ہے۔ اس اعتبار سے فراعنہ نے مصر پر جو کچھ خرچ کیا تھا اسے آج کے مصری "کیش" کر رہے ہیں۔ گویا کہ وہ فرعون کے نام کی "روٹی" کھا رہے ہیں اور اس فن میں اہل مصر بڑے ماہر و یکتا نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے فرعون مر کر گویا کہ آج بھی زندہ نظر آتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی مصریوں کے دلوں میں فرعونوں کی

بڑی قدر و منزلت ہے اور بہت سے مصری تو ان کو اپنا قومی ہیرو تصور کرتے ہوئے فرعونی تہذیب و تمدن پر فخر کرتے ہیں۔

سابق مصری صدر جمال عبد الناصر تو بڑے فخر کے ساتھ کہتے تھے: نحن ابناء الفراعنۃ یعنی ہم فرعونوں کی اولاد ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس نسبت میں فرعونوں کی مردانگی کی طرف اشارہ ہو اور یہ بات وہ اپنے دشمنوں اور خاص کر اسرائیل کو ڈرانے کی غرض سے کہتے رہے ہوں۔ مگر ان کے اس رجحان سے ہوا کے رخ کا پتہ ضرور چل جاتا ہے۔

بہر حال مصری پیسہ کمانے کے لئے نئے نئے طریقے خوب ایجاد کرتے ہیں۔ جس کی ایک مثال "قریہ فرعون" کا اختراع ہے۔ چنانچہ آج کل قاہرہ سے باہر ایک بستی بسائی گئی ہے جہاں پہ فرعونی دور کی تہذیب اور اس کے نقش و نگار کو زندہ اور ہو بہو شکل میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی یہاں پر فرعونی دور کے لباس، اس کے رہن سہن اور اس کے طور طریقوں کی نقل دکھائی جاتی ہے، جنھیں دیکھ کر ناظرین محسوس کرتے ہیں کہ ہم فرعونی دور کی تہذیب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اسے دیکھنے کے لئے بھاری فیس وصول کی جاتی ہے۔ یہ بستی میں خود تو نہیں دیکھ سکا مگر اس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اسے قلم بند کر دیا ہے۔

ایک عبرت انگیز منظر

الغرض فرعونی دور کے ان عظیم آثار و باقیات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان جناتی ہیکلوں کی تعمیر میں کس قدر مالی و انسانی وسائل جھونک دئے گئے ہوں گے۔ یہ تمام ہیبت ناک آثار فرعونوں کی بے انتہا دولت اور ان کے رعب و دبدبے کے مظہر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بارے میں جو کچھ فرمایا تھا اس کا مفہوم آج واضح طور پر نظر آرہا ہے:

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ	اور موسیٰ نے کہا کہ اے ہمارے رب

فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ۔ (یونس: ۸۸)

تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی زندگی میں زینت اور مال و دولت عطا کیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو تیرے راستے سے ہٹا سکیں۔ اے ہمارے رب تو ان کے مالوں کو اجاڑ دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے، یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں جب تک کہ سخت عذاب کا نظارہ نہ کرلیں۔

واضح رہے اس موقع پر لفظ "اطمس" استعمال کیا گیا ہے جو "طموس" سے ہے اور اس کے معنی کسی چیز کی شکل وصورت بگاڑنے یا اسے اجاڑ دینے کے ہیں چنانچہ آج یہ فرعونی یادگاریں اکثر و بیشتر اجڑی ہوئی یا بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہیں اور بعض عمارتوں کے صرف کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں جو اپنے آپ میں ایک عبرت ہے، وہ عمارتیں جن کی تعمیر پر موجودہ دور کے حساب سے اربوں نہیں بلکہ کھربوں کھربوں روپے صرف کئے گئے ہوں گے اور ان کی تکمیل میں پتہ نہیں کتنے لاکھ مزدوروں کو مروایا گیا ہوگا۔ مگر نتیجہ کیا نکلا؟ آج یہ سب گویا کہ اوندھے منہ پڑے ہوئے بے انتہا مال و متاع کے ضیاع و اسراف پر ماتم کناں ہیں اور دور کے جباروں کی بے عقلی پر آنسو بہا رہے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِن بَعْدِهِم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ

اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا مگر وہ ان نشانیوں کو خاطر میں نہیں لائے۔

عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ (اعراف: ۱۰۳)

تو دیکھو فساد پروروں کا انجام کیا ہوا۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ

مقامات قرآن کی تحقیق

مجھے افسوس ہے کہ وقت کی تنگی اور خرابی صحت کے باعث میں اقصر (فرعون کا اصل مرکز) نہیں دیکھ سکا۔ بلکہ اس بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کتابی معلومات کی بنا پر ہے۔ چنانچہ خوش قسمتی سے مجھے قاہرہ میں دو گائیڈ بکس مل گئیں جو مصر کے آثار قدیمہ اور وہاں کے قدرتی مناظر وغیرہ کے تعارف اور ان کی رہنمائی کے لئے ایک بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں تمام اہم مقامات کی انتہائی عمدہ اور نفیس ترین تصویریں بھی بکثرت موجود ہیں۔ ان کے ملاحظے سے قدیم وجدید مصر کا پورا نقشہ اس طرح سامنے آجاتا ہے گویا کہ ہم ان آثار و مناظر کو اپنی آنکھوں سے ہو بہو دیکھ رہے ہیں[۲۴]۔

یہ دونوں کتابیں قاہرہ میوزیم اور دیگر سیاحتی مراکز میں برائے فروخت دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ مصر اور قاہرہ وغیرہ کے عمدہ نقشہ جات بھی ملتے ہیں۔ یہ تفصیل میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ کوئی باہمت شخص اس موضوع پر مزید تحقیقی کام کرے اور یہ قرآنی نقطہ نظر سے بہت بڑی خدمت ہوگی اور اس سے مقامات قرآنی یا ارض القرآن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی اور جہاں تک مصر اور فراعنہ کے بارے میں تاریخی معلومات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور دیگر مراجع میں کافی مواد موجود ہے۔ چونکہ اس وقت راقم سطور محض ایک سفرنامہ لکھ رہا ہے اس لئے اس موقع پر زیادہ تفصیل میں جانا مشکل ہے۔ یہ موضوع ایک مستقل کتاب کا طالب ہے۔

مراجع و حواشی

۱ دیکھئے برٹانیکا ملٹی میڈیا انسائیکلوپیڈیا، ۱۹۹۷ء (یہ انسائیکلوپیڈیا ایک "سی ڈی" ہے، جسے

کمپیوٹر پر دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے اور اس کی مدد سے کسی بھی چیز کی تمام معلومات صرف اس کا نام ٹائپ کردینے سے اسکرین پر آجاتی ہیں۔ اس طرح سکنڈوں میں مطلوبہ معلومات مل جاتی ہیں) [۲] دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (خورد) ۸/۱۰۔۱۴، مطبوعہ ۱۹۸۳ء، نیز آکسفورڈ السٹریٹڈ انسائیکلو پیڈیا: ۲۹۹/۳ مطبوعہ ۱۹۹۳ء [۳] یہ موجودہ شہر پورٹ سعید سے قریب تھا [۴] دیکھئے معجم البلدان: ۲۶۲/۴، دار صادر بیروت، ۱۹۸۴ء [۵] دیکھئے المنجد فی الادب والعلوم، ص ۵۶، بیروت [۶] دیکھئے مصر، از زکی نجیب محمود، ترجمہ سید ہاشمی فریدآبادی، ص ۱۸، مطبوعہ لاہور [۷] دیکھئے برٹانیکا ملٹی میڈیا انسائیکلو پیڈیا، ۱۹۹۷ء [۸] مرجع سابق [۹] معجم البلدان: ۲۳۷/۱ [۱۰] بریف ہسٹری آف کیرو دکیرو ٹورسٹ میپ) [۱۱] دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۵۰۱/۱۵، مطبوعہ ۱۹۸۳ء [۱۲] آکسفورڈ السٹریٹڈ انسائیکلو پیڈیا: ۲۹۹/۳، نیویارک ۱۹۹۳ء [۱۳] دیکھئے This is Egypt مطبوعہ قاہرہ [۱۴] دیکھئے المنجد فی الادب والعلوم، ص ۳۴، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۶ء [۱۵] دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (خورد) ۶۰۶/۷ مطبوعہ ۱۹۸۳ء [۱۶] برٹانیکا ملٹی میڈیا انسائیکلو پیڈیا، ۱۹۹۷ء [۱۷] ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا: ۲۵۶/۱۵ مطبوعہ لندن، ۱۹۹۶ء [۱۸] برٹانیکا ملٹی میڈیا انسائیکلو پیڈیا، ۱۹۹۷ء [۱۹] دیکھئے کتاب پیدائش باب ۴۰-۴۱، کتاب مقدس، مطبوعہ لاہور ۱۹۲۲ء [۲۰] کتاب پیدائش (۴۱: ۴۱) [۲۱] ایضاً (۴۱: ۴۳) [۲۲] دیکھئے مصر از زکی نجیب (مرجع سابق) ص ۲۳-۲۴ [۲۳] دیکھئے آل آف ایجپٹ، ص ۱۱۸-۱۲۰، مطبوعہ اٹلی [۲۴] ان دونوں کتابوں کے نام اس طرح ہیں: This is Egypt (یہ مصر ہے)

All of Egypt (مصر کے بارے میں سب کچھ)

مولانا احمد سعید دہلویؒ

از ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، ٭

" مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم صدر جمعیۃ علمائے ہند صف اول کے علما اور جنگ آزادی کے ممتاز مجاہدین میں تھے، افسوس ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی مجاہدانہ خدمات کو قصداً فراموش کیا جارہا ہے اس لئے اس طرح کے مضامین کی اشاعت ناگزیر معلوم ہوتی ہے " (ض)

مولانا احمد سعید دہلویؒ کا علمی تبحر بے مثال تھا۔ وہ فاضل اجل تھے، بہترین خطیب تھے، انتہائی خوش گفتار تھے، جب خالص دہلی کی ٹکسالی زبان میں گفتگو فرماتے تو معلوم ہوتا کہ دہنِ مبارک سے گل پاشی فرما رہے ہیں۔ جب تقریر فرماتے تو سامعین اتنے دم بخود اور ہمہ تن گوش ہوجاتے کہ معلوم ہوتا جیسے ان پر کسی نے سحر کردیا ہو۔ مولانا شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ان کی تحریریں شگفتگی اور چاشنی سے لبریز ہوتیں، ان میں اختصار اور جامعیت بھی پائی جاتی۔ ہر لفظ ناپ تول کر استعمال کرتے۔ جملوں کی بندش ایسی کہ ان میں نہ کسی لفظ کے اضافے کی گنجائش ہوتی نہ تخفیف کی۔

مولانا کی فصاحت و بلاغت اور خوش گفتاری و شیریں مقالی ضرب المثل تھی۔ اسی لئے ان کو ' سحبان الہند ' کے لقب سے یاد کیا جاتا۔ اس نسبت کی صحیح قدر و قیمت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ' سحبان ' کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے۔ سحبان حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں مشہور شاعر

٭ ڈپٹی لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ۔

گزرا ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت میں بے نظیر و بے عدیل تھا۔ اس کے باپ کا نام وائل تھا۔ اس لیے "سحبان وائل" مشہور ہوا۔ اس کی فصاحت نے ضرب المثل کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

مولانا کی صحیح تاریخ ولادت کا علم نہ ہو سکا۔ عام خیال ہے کہ وہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ خود مولانا کو بھی اس کا صحیح علم نہیں تھا۔ محض قیاس کی بنیاد پر انہوں نے ۱۸۸۸ء متعین فرمالیا تھا چنانچہ اپنے مخلص دوست جناب ملا واحدی کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے اپنی ولادت کا حساب ۱۸۸۲ء لگایا تھا۔ میونسپلٹی کا ریکارڈ پچھلے ہنگاموں میں تلف ہو چکا ہے۔ اس لئے بابطہ کوئی ثبوت میرے پاس نہ تھا۔ البتہ مدار کا چاند یعنی جمادی الاولیٰ مجھے یاد تھا اور یہ بھی یاد تھا کہ قاضی لطیف الحق حقی اور میں ایک مہینہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ بالآخر میں نے ۱۸۸۸ء پر پختہ رائے کر لی اور "منظر اللہ" تاریخی نام بھی نکال کر بیٹھ گیا ہوں۔ لیکن آپ کے خط نے مجھے پھر شک میں ڈال دیا۔"[1]

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ان کے والد حافظ محمد نواب مرزا (متوفی ۱۹۰۸ء) کی زیر نگرانی ہوئی۔ ان ہی کی نگرانی میں کلام پاک حفظ کیا۔ اعلیٰ تعلیم اور علوم دینیہ کی تکمیل مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی سے مفتی محمد کفایت اللہ کی زیر سرپرستی کی۔ مدرسہ امینیہ کو ہندوستان کے اسلامی مدارس میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ اسے ۱۸۹۶ء میں مولانا امین الدین اورنگ آبادی نے قائم کیا تھا جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اس مدرسہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس سے مولانا انور شاہ کشمیری، مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا ضیاء الحق دیوبندی جیسی نابغۂ روزگار شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ مولانا احمد سعید صاحب اس مدرسہ کے بہت ممتاز اور مفتخر طالب علم تھے۔

[1] بحوالہ "دلی والے"، مرتبہ صلاح الدین۔ دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء، ص ۴۴-۴۵۔

حضرت سحبان الہند صحیح معنی میں دلی والے تھے۔ اس کی مخصوص اسلامی تہذیب کے دلدادہ، اس کی ٹکسالی زبان اور محاوروں کے گرویدہ، مخصوص شیریں اور شگفتہ لہجہ کے حامل۔ ان کی سکونت دہلی کے مشہور کوچہ چیلان میں تھی اور زندگی بھر اسی کوچہ سے وابستہ رہے۔ اس کوچہ کو تاریخی اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ خواجہ محمد ناصر عندلیب، خواجہ میر درد، خواجہ محمد میر اثر، حکیم مومن خاں مومن، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مفتی محمد کفایت اللہ، ملا واحدی، ڈ بیرسٹر آصف علی جیسی نامور ہستیاں اسی کوچہ میں رہائش پذیر رہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب نے بڑی فعال زندگی بسر کی۔ وہ مذہبی تحریکوں سے بھی متعلق رہے اور سیاسی تحریکوں سے بھی۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دیگر اکابر ملت اور زعمائے قوم کے ساتھ متعدد بار درزنداں پر دستک دی اور اس کی کال کوٹھریوں کو اپنے وجود سے منور کیا۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۲ء، ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء میں جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کی اسارت کی مجموعی مدت تقریباً دس سال ہوتی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جب وہ میانوالی جیل میں اسیر تھے تو ان سے چکی پیسنے کی مشقت بھی لی گئی۔ مولانا شاعر بھی تھے جیل میں عالم تنہائی میں تفنن طبع کی خاطر مشق سخن بھی کرتے تھے۔ اس لئے مولانا حسرت موہانی کا یہ مشہور شعر ؎

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ان کے اوپر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا کے ساتھ ان کے دو صاحبزادے حافظ محمد سعید (متوفی ۵ دسمبر ۱۹۶۵ء) اور مولوی مظہر سعید (متوفی ۱۹ جنوری ۱۹۶۸ء) بھی قید کیے گئے تھے۔

۱۹۱۹ء کے آخری دنوں میں جمعیۃ علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا تاسیسی اجلاس

۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے فرمائی تھی۔ اسی دن سہ پہر میں اس کا دوسرا اجلاس مفتی محمد کفایت اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اسی تاسیسی جلسہ میں مولانا احمد سعید صاحب کو جمعیۃ علماء کا ناظم عمومی مقرر کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء تک وہ مسلسل اس منصب پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ کل ہند جمعیۃ کے نائب صدر اور اس کی دہلی شاخ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے وصال کے بعد وہ اس کے صدر بنائے گئے اور اپنی وفات (۴ دسمبر ۱۹۵۹ء) تک اسی عہدے پر فائز رہے۔

مولانا سیاسی خیالات کے لحاظ سے نیشنلسٹ مسلمان تھے۔ آخر وقت تک کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے اور اسی کے ٹکٹ پر ۱۹۵۷ء میں پارلیمنٹ کا الیکشن بھی لڑے۔ وہ مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کے شدید مخالف تھے اور اسے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مہلک تصور کرتے تھے۔ اسی طرح تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان سے ترکِ سکونت کرکے پاکستان کو چلا جانا بھی انہیں سخت ناپسند تھا۔ اس کا اندازہ ان کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے پاکستان میں اپنے احباب کو لکھے۔ مثلاً ایک خط میں اپنے مخلص دوست اور اردو کی مشہور شخصیت ملا واحدی کو ان کے پاکستان چلے جانے پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میاں میں تو تمہاری تلاش میں تھا۔ پتہ کوئی نہیں بتاتا تھا۔ تمہیں خبر بھی ہے تم نے کتنا گناہ عظیم کیا ہے۔ اللہ کے ہاں اس کی باز پرس ہوگی۔ تب پتہ چلے گا۔ تمہارے بھاگنے سے سارا محلہ بھاگ پڑا"[1]

---

[1] بحوالہ: دلی والے۔ حصہ اول۔ ص ۹۴۔

۱۹۴۷ء کی رستاخیز میں مولانا دہلی میں ہی رہے اور دہلی والوں کی ہر طرح سے خدمت کرتے رہے۔ اس قیامتِ صغریٰ میں جن حضرات نے مسلمانانِ دہلی کی پشت پناہی کی، آڑے وقت میں ان کی ڈھارس بندھائی، مشکلات میں ان کی دستگیری کی اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ان کی جانیں بچائیں ان میں سحبان الہند کے علاوہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن، رفیع احمد قدوائی، میر مشتاق احمد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی خدمات جدید ہندوستان کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ مولانا کی بے لوثی، بے غرضی، قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ تنگ دستی اور عسرت کے زمانے میں بھی آپ نے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ انہوں نے نہ کبھی کسی منصب کی خواہش کی، نہ کسی عہدے کے لیے کوشش کی اور نہ مالی منفعت کے لئے جدوجہد کی۔ اس کا ثبوت صرف اس ایک واقعہ سے پیش کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۲۲ء سے ان کو ریاست حیدرآباد سے مبلغ تین سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا لیکن جب انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا تو انگریز حکومت کے اشارے پر ریاستِ حیدرآباد کے اربابِ اقتدار نے انہیں سیاست میں حصہ نہ لینے کا مشورہ دیا اور اشارتاً یہ بھی کہا کہ بصورت دیگر وظیفہ سے محروم ہونا پڑے گا۔ یہ بات مولانا کی حریت پسندی اور جذبۂ خودداری کے منافی تھی اس لئے انہوں نے نہ صرف اس مشورہ کو قبول کرنے سے صاف انکار کردیا بلکہ وظیفہ کو بھی ٹھکرا دیا اور اقبال کے اس شعر کی عملی تفسیر بن گئے:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مزید یہ کہ بعد میں ریاست کے بار بار اصرار پر بھی وظیفہ کو دوبارہ جاری نہیں کرایا۔ مولانا اگر چاہتے تو حصولِ آزادی کے بعد اپنے اور دیگر افراد خاندان کے لئے بہت سی

مراعات حاصل کر سکتے تھے اس لئے کہ آزاد ہندوستان کے تمام ارباب اقتدار بشمول صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے بے حد اچھے مراسم تھے اور یہ حضرات مولانا کا بہت احترام کرتے تھے۔ یہ بات بھی اب کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آزادی کے بعد پنڈت نہرو نے ہمارے اکابر کو جنھوں نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا اور وطنِ عزیز کی آزادی کی خاطر بے مثال قربانیاں پیش کی تھیں، مختلف انداز سے نوازنا چاہا، کسی کو عہدے پیش کئے، کسی کو اعزازات اور کسی کو وظیفے۔ حضرت سحبان الہند کے لئے تین سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرنا چاہا اور اپنے سکریٹری جان متھائی کو ایک فارم لے کر ان کی خدمت میں بھیجا کہ اس پر وہ دستخط کر دیں تو حکومت کی جانب سے ان کے لئے وظیفہ جاری ہو جائے لیکن انہوں نے وزیر اعظم کی اس درخواست کو شرف قبولیت نہیں بخشا۔ دراصل ان تمام اکابر نے یہ موقف اپنایا کہ اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کے لئے جد و جہد کرنا ان کا مذہبی فریضہ تھا اور مذہبی فریضہ کی ادائیگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

مولانا انتہائی بے باک اور نڈر انسان تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دہلی کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اور ان کے آثار و معابد کو ختم کر کے ان کے نشانات تک مٹا دینے کی کوششیں کی جا رہی تھیں، اس وقت دیگر اکابر کے ساتھ مولانا بھی سینہ سپر ہو کر میدان میں آ گئے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو اور دوسرے ارباب اقتدار سے مسلسل ربط قائم رکھا اور انہیں مجبور کیا کہ حالات پر قابو پانے اور امن و امان بحال کرنے کے لئے موثر اقدامات کریں۔ انہیں حضرات کی کوششوں سے امن قائم کرنے کی غرض سے گاندھی جی نے دہلی شہر کا دورہ کیا۔ اسی دورے میں وہ خصوصی طور پر حضرت سحبان الہند سے ملاقات کرنے ان کے مکان پر بھی تشریف لے گئے۔ مولانا ان کو حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ پر بھی لے گئے اور اس کی

حالتِ زار سے واقف کرایا اور پھر گاندھی جی کے ہی اصرار پر اس کی صفائی اور مرمت اپنی نگرانی میں کرائی۔

مولانا کو علما سے بڑا گہرا اور قلبی تعلق تھا۔ مفتی محمد کفایت اللہ کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ مفتی صاحب ان کے استاد بھی تھے اور زمانۂ طالب علمی میں نگراں اور سرپرست بھی رہے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بھی خصوصی تعلق تھا۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو حضرت مدنی کی وفات پر انہوں نے جو تعزیتی مضمون سپرد قلم کیا تھا اس کے ایک ایک لفظ سے عقیدت و احترام کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

"......ان کی وہ تعلیمی خدمات جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں انجام دی ہیں اور اس اندرونی خلفشار کے زمانے میں جب کہ دارالعلوم کی حیات خطرہ میں تھی، دارالعلوم کی سرپرستی فرما کر اس کو سنبھالا اور بچایا ہے۔ حضرت شیخ کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی عظمت و صداقت کا صلہ دربار رسالت سے تو مولانا مدنی کو ملے ہی گا لیکن دارالعلوم کے در و دیوار اور وہاں کی خاک کے پاک ذرے بھی مولانا مدنی کے خلوص پر قیامت کے دن شہادت دیں گے، اس تمام دینی اور وطنی خدمت کے باوجود ان کی ریاضت و عبادت اور کشف و کرامات کے حالات وہ حضرات بخوبی جانتے ہیں جنھوں نے رمضان شریف کی راتیں حضرت اقدس کی خدمت میں رہ کر گذاری ہیں یا جن کو جیل خانے کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں ان کے ہمراہ رات بسر کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ میں ایک دور افتادہ اور علم و عمل کی روشنی سے محروم اس پر کیا لب کشائی کر سکتا ہوں۔ صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں ......کہ حضرت شیخ الاسلام آزادی وطن کے ایک جانباز جرنیل تھے اور بین الاقوامی شخصیت اور علم و عمل اور زہد و تقویٰ اور ایثار و قربانی کے مجسم پیکر اور اخلاق و انسانیت

کے سب سے بلند و بالا منظر اور سلف صالحین کی ایک زندہ یادگار تھے جن کا سایہ ہم بدقسمتوں کے سر سے اٹھ گیا اور ہم کو یتیم ولاوارث کر گیا جس کا ہمسر اور مثل وعدیل صدیوں میں بھی میسر آنا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مقام صدق میں ایک مقتدر کے قرب سے نوازے اور ہم کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین"[1]

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ان کو خصوصی لگاؤ اور قلبی تعلق تھا۔ امام الہند بھی ان کا بہت ادب واحترام کرتے تھے جس زمانے میں مولانا آزاد کلکتہ میں رہائش پذیر تھے، اس زمانے میں سحبان الہند کئی بار ان کے مہمان رہے تھے۔ اس کی یادیں آخر وقت تک ان کے حافظے میں محفوظ رہیں۔ اس کا تذکرہ انہوں نے مولانا آزاد کے انتقال کے بعد ایک تعزیتی مضمون میں بھی کیا ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی گوناگوں صفات کا تذکرہ کیا ہے ان سے مولانا کے صحیح مقام و مرتبہ کا علم تو ہوتا ہی ہے اسی کے ساتھ دونوں کے مراسم کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد صرف علوم مذہبی کے متبحر اور ایک جلیل القدر، بلند پایہ عالم ہی نہ تھے بلکہ میدان سیاست کے بھی وہ بہترین شہسوار تھے اور سیاست میں وہ نہایت مدبر اور انتہائی دوراندیش مفکر اور معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ ان کو تمام ایشیا کی سیاست سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کو قدرت نے بڑی بصیرت اور فہم صحیح عطا فرمایا تھا۔ ہندوستان کی حکومت میں ان کا بڑا پایہ تھا۔ وہ اس حکومت کے وزیر تعلیم ہی نہ تھے بلکہ وزیر اعظم کے دست راست اور ان کے بازوؤں کی قوت تھے۔ ان کے مفید مشورے پوری حکومت کے لئے رہنمائی کا کام کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے الجھے ہوئے معاملات کو

[1] الجمعیۃ۔ دہلی شیخ الاسلام نمبر۔ ۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء ص ۵۔

اپنے خداداد تدبر سے ہوش مندی و دانش وری کے ساتھ سلجھا دیا کرتے تھے۔ وہ سیاسی سوجھ بوجھ میں بے مثل اور بے نظیر تھے۔ وہ ادب میں ایسے بے مثل ادیب تھے کہ ان کی تقریر و تحریر کا جواب ان کی زندگی میں کسی دوسرے انسان سے بن نہ آسکا۔ ان کے کلام میں ایسی جدید اور انوکھی بندشیں ہوتی تھیں جو صرف ان ہی کا حصہ تھا اور قدرت نے اس انوکھے طرز تعبیر کو ان کے لئے مخصوص فرما دیا تھا۔ بہر حال وہ ادب، سیاست اور مذہب کے بہترین اور بے مثل شناور تھے۔ اب دنیا اس شہسوار علم وفن کو مدتوں روتی رہے گی اور اس کا کوئی دوسرا ہمسر نہ پا سکے گی۔ میدان جنگ میں ان کے جنگی تدبیروں نے لارڈ ویول اور لارڈ ارون کو عاجز اور درماندہ کر دیا تھا۔

وہ ان تمام علمی، ادبی اور سیاسی خوبیوں کے ساتھ انتہائی خوش طبع اور انتہائی خوددار تھے۔ خوش طبعی بھی ان کی ادب اور جدید بندشوں سے لبریز ہوتی تھی۔ وہ اپنی رائے ظاہر کرنے میں کبھی جھجکتے نہ تھے"[1]

اس کے بعد اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

"خلافت کے دور میں ایک جلسہ کی جب وہ صدارت فرما رہے تھے، میں نے تقریر کی تھی۔ یہ جلسہ شاید کلکتہ میں ہوا تھا۔ کلکتہ میں کئی مرتبہ ان کی مہمان نوازی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان پر مختلف دور گزرتے رہے اور میں نے ان کو ہر حال میں صابر اور شاکر پایا"[2]

ان دونوں حضرات کے خیالات اور افکار کی ہم آہنگی اور یک جہتی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جمعہ کی نماز کے بعد دہلی کی تاریخی جامع مسجد میں مسلمانوں کا جو عام جلسہ ہوا تھا اور جس میں مولانا آزاد نے تاریخ ساز تقریر فرمائی تھی اور مسلمانوں کو ملک کی تقسیم کے

[1] الجمعیۃ۔ دہلی (آزاد نمبر ۳ر دسمبر ۱۹۵۸ء) ص ۵۳ [2] ایضاً۔

نتیجہ میں پیدا شدہ ناسازگار حالات سے مغلوب ہو کر ہندوستان سے ترک سکونت کر کے پاکستان جانے کے ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا، اس جلسہ کی صدارت حضرت سحبان الہند نے ہی فرمائی تھی۔ اسے ہم ان کی عالی ظرفی ہی قرار دے سکتے ہیں کہ مولانا آزاد کی وفات پر جو تعزیتی مضمون تحریر فرمایا تھا اور جس کے دو اقتباسات گزشتہ صفحات پر پیش کئے گئے، اس میں انہوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مولانا کی صدارت میں منعقد ہونے والے جلسہ میں انہوں نے تقریر کی تھی لیکن اس بات کا تذکرہ نہیں فرمایا کہ خود ان کی زیر صدارت منعقدہ جلسہ میں مولانا نے تقریر فرمائی تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مولانا آزاد کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) پر ان کے جنازے کی نماز حضرت سحبان الہند نے ہی پڑھائی تھی۔ مولانا آزاد جیسے بے مثال عالم دین، مفسر قرآن، فصیح اللسان خطیب، جادو بیان مقرر اور بہترین نثر نگار کے لئے یہ بات انتہائی موزوں تھی کہ مولانا احمد سعید صاحب جیسے جید عالم، عظیم المرتبت مفسر، عارف اسرار شریعت و طریقت، آفتاب فصاحت و بلاغت اور شہنشاہ خطابت اور سحبان الہند کو ہی ان کی نماز جنازہ کی امامت کا شرف حاصل ہو۔

مولانا نے ۴ دسمبر ۱۹۵۹ء بروز جمعہ ساڑھے سات بجے شب اچانک داعی اجل کو لبیک کہا، اگلے دن درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے باہری حصہ ظفر محل کے قریب خود ان کی وصیت کے مطابق مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کی دائیں جانب تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ امیر جماعت تبلیغ نے پڑھائی۔ غالبؔ نے شاید ایسے ہی سانحات کے لئے کہا تھا ؂

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

حضرت سحبان الہند تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی خطابت

پرجوش، مواعظ پُرمغز و دل نشین اور تقاریر شگفتہ اور اثر آفریں ہوتی تھیں۔ آواز میں سوز تھا اس لئے حاضرین ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سنتے اور اثر قبول کرتے۔ اسی طرح ان کی تحریریں بھی فصاحت سے لبریز اور دل آویز ہوتی تھیں۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ تصانیف کی تعداد بیس تک پہنچتی ہے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) جنت کی کنجی (۲) دوزخ کا کھٹکا (۳) مشکل کشا (۴) خدا کی باتیں (۵) رسول کی باتیں۔ (۶) دین کی باتیں (۷) پردہ کی باتیں (۸) شوکت آرا بیگم (۹) از بلا (۱۰) جنت کی ضمانت (۱۱) ماہِ رمضان (۱۲) صلوٰۃ و سلام (۱۳) عرش الٰہی کا سایہ (۱۴) تفسیر کشف الرحمٰن (۱۵) تقاریر احمد سعید (۱۶) پہلی تقریر سیرت (۱۷) دوسری تقریر سیرت (۱۸) رسول اللہؐ کے تین معجزات (۱۹) مکاتیب احمد سعید (۲۰) ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں۔

یہ تمام تصانیف اصلاحی اور تبلیغی نوعیت کی ہیں۔

مولانا شاعری بھی کرتے تھے۔ اسیر تخلص تھا۔ افسوس کہ اب ان کا کلام دستیاب نہیں۔ ذوقِ سخن بہت اعلیٰ اور پاکیزہ تھا۔ ان کو ادبی محفلوں اور شعری نشستوں سے بڑی رغبت تھی آج کل یوم جمہوریہ کے موقع پر لال قلعے میں جو کُل ہند مشاعرہ منعقد ہوتا ہے اس کا ابتدا ۱۹۵۲ء میں ہوئی تھی۔ اس عظیم ادبی روایت کو قائم کرنے کا سہرا حضرت سحبان الہند ہی کے سر ہے۔ ان ہی کی مساعی جمیلہ سے اس کی بنیاد پڑی۔ ان ہی نے اس سلسلہ کے پہلے مشاعرے منعقدہ ۱۹۵۲ء کی صدارت فرمائی تھی۔ ان ہی کی کوششوں سے پنڈت جواہر لال نہرو نے بطور خاص اس میں شرکت کی تھی۔ اس میں مولانا نے جو غزل پیش کی تھی اس کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

لوگ جب میت مری لے کر چلے   میرے ارماں نوحہ گر بن کر چلے

زندگی سے اپنی گھبرا کر چلے   گھر سے آئے تھے پلٹ کر گھر چلے

ایسے آنے سے نہ آنا خوب تھا — شام آئے شب سے پہلے گھر چلے

تیرے صدقے اے شہ لطف و کرم — ہاتھ خالی آئے دامن بھر چلے

ساقیا ظاہر ہو یوں شانِ کرم — میکدے سے جو چلے پی کر چلے

مقصد اپنا ہو گیا پورا اسیر

مرنے آئے تھے کسی پر، مر چلے

افسوس ہے مولانا نے یہ غزل خود نہیں پڑھی تھی، بلکہ مشہور شاعر جناب بسمل شاہجہاں پوری سے پڑھوائی تھی۔ بسمل صاحب کی آواز بہت بلند اور پاٹ دار تھی اور بڑے والہانہ انداز میں شعر پڑھتے تھے۔

جناب انیس دہلوی نے مولانا سے متعلق ایک مضمون میں ان کی ایک مناجات بھی نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ "شب قدر میں اس رات کی فضیلت کچھ اس طرح بیان کرتے کہ مغفرت کی دعا کرتے وقت لوگ دہاڑیں مار مار کر روتے تھے۔

مولانا کے پاس کوئی حساب تھا جس سے وہ رمضان میں شب قدر کا قیاس کرتے تھے اور رات کے پچھلے پہر اندھیرا کر کے بڑے جذباتی انداز میں دعا کراتے تھے اور اپنی لکھی ہوئی یہ مناجات بھی پڑھتے تھے۔

منتظر ہیں آنے کی آنکھیں ہماری دیر سے — آنے والے آ، یہ مجمع طالب دیدار ہے

جلوہ دکھلا کر تمنا پوری کر دے دید کی — اپنی چشم شوق پورے سال سے بیدار ہے

کچھ سنے تو عرض کر دیں دردِ دل کا مدعا — گرچہ قابو میں نہیں دل اور زباں بیکار ہے

سخت طوفاں ہے، ہوائیں ہیں خلاف — اس پہ آفت یہ کہ کشتی بر سرِ منجدھار ہے

تنگ جینے سے ہوئے ہیں جینے والے اے کریم — زندگی سے اپنی ہر اک باحیا بیزار ہے

بخشنے سے گر گناہوں کے تجھے کچھ عذر ہے — پھر بتا، جائیں کہاں وہ کون سی سرکار ہے

پھیر جا، اپنی معانی کا قلم بس پھیر جا

کہنے والا کہہ گیا ہے تو مرا ستار ہے[1]

مولانا کی سب سے اہم اور وقیع علمی و دینی خدمت ان کی **تفسیر قرآن** ہے جسے اٹھارہ برس کی مسلسل محنت اور جاں فشانی کے بعد مکمل کیا۔ اس کی ابتدا ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی اور ۱۹۵۶ء میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ۲۴ شعبان ۱۳۷۵ھ/ مارچ ۱۹۵۶ء تاریخ تکمیل ہے۔ افسوس کہ اس کی اشاعت مولانا کی حیات میں نہ ہو سکی۔ وفات کے پانچ سال بعد ۱۳۸۲/ ۱۹۶۲ء میں ان کے خلف رشید حافظ محمد سعید نے اسے 'کشف الرحمٰن' کے عنوان سے ندوۃ المصنفین دہلی سے شایع کرایا۔ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے جس سے اس ترجمہ و تفسیر کی بڑی حد تک وضاحت ہو جاتی ہے:

"یہ وہ ترجمہ ہے جس کو سحبان الہند حضرت الحاج حافظ مولانا احمد سعید صاحب نے علما کی ایک موقر جماعت کے مشورے سے کیا ہے اور اس کو مفتی اعظم علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب کی سرپرستی اور نگرانی حاصل رہی ہے۔ قرآن شریف کے ترجمے اور تیسیر القرآن و تسہیل القرآن کی ترتیب و تالیف حضرت سحبان الہند کی اٹھارہ سال محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔"

یہ تفسیر ہندوستان کے علاوہ پاکستان سے بھی شایع ہوئی ہے۔ ندوۃ المصنفین والے ایڈیشن کی کتابت اور طباعت دونوں نہایت شاندار اور دیدہ زیب ہیں۔ اس کی ضخامت کو مناسب حد تک محدود رکھنے کی غرض سے اسے دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی

---

[1] دلی والے۔ حصہ اول ص ۵۴۔

صفحات میں ترجمہ اور تفسیر سے متعلق علمائے کرام کی آرا بھی درج ہیں اور تمام حضرات نے ہی یک زبان ہوکر اس کی زبان، انداز بیان، حواشی کی جامعیت و معنویت اور علمیت کی دل کھول کر داد دی ہے۔ ان علماء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا حافظ سید حمید اللہ (امام جامع مسجد دہلی)، مولانا مفتی سید مہدی حسن (مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند)، مولانا عبدالوہاب آروی (صدر آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس)، مولانا محمد فخر الدین (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)، مولانا محمد سعید (مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، سورت)، مفتی محمد صالح سورتی (خطیب جامع مسجد، رنگون)، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا سید اعزاز علی (شیخ الحدیث والادب دارالعلوم دیوبند)، مولانا عبدالصمد رحمانی (نائب امیر شریعت، صوبۂ بہار) کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد کلامی معجزہ کے عنوان سے قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم، دیوبند) کی ایک طویل تقریظ بھی شامل کی گئی ہے۔ اس ترجمہ کے بارے میں قاری صاحب کا یہ فرمانا بڑی اہمیت و وقعت رکھتا ہے کہ:

"مجھے تمام تراجم میں بوجہ بلاغت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ترجمہ پسند تھا، لیکن یہ ترجمہ شگفتگی میں اس سے بھی کچھ سوا ہی نظر آتا ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ اپنی تحریرات میں جہاں آیات کے ترجمے درکار ہوں گے تو اس ترجمے کی نقل پر قناعت کرسکوں گا۔"

ابتدا میں اظہار تشکر کے عنوان سے حافظ محمد سعید صاحب کی تحریر ہے جس میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا گیا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس ترجمہ و تفسیر کی تسوید اور بعد ازاں اس کی اشاعت میں معاونت کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس طریق کار کی وضاحت بھی کی ہے جو حضرت سحبان الہند نے اس کی تالیف کے سلسلہ میں اختیار کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے کام لیا اور علماء و نقاد سے ہر ہر قدم پر

صلاح و مشورہ جاری رکھا۔ اس طرح اس عظیم تفسیری خدمت کو ہر لحاظ سے مستند اور معیاری بنانے کی سعی بلیغ کی۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"روزانہ کام کرنے کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز پڑھ کر فراش خانہ میں کڑہ بڑو کی مسجد میں تشریف لے جاتے۔ وہاں ڈیڑھ، دو گھنٹے قرآن شریف کا ترجمہ بیان فرماتے۔ اس مسجد میں کم و بیش تیس بتیس سال آپ نے ترجمہ قرآن کریم فرمایا۔ ترجمے سے فارغ ہوکر مکان تشریف لے جاتے اور ترجمہ قرآن کریم لکھنے میں مشغول ہوجاتے۔ قرآن کریم کے اس ترجمے میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ بھی وقتاً فوقتاً شرکت فرمایا کرتے تھے۔ علمائے کرام کی ایک مختصر جماعت مولانا کے سامنے مختلف ترجموں کے قرآن کریم اور تفسیریں کھولے بیٹھے رہتی۔ کبھی آپ ایک سے ترجمہ سنتے، پھر دوسرے کو ارشاد فرماتے اور پھر تفسیروں کو پڑھواتے۔ اخیر میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کو سنتے۔ سب کچھ سننے کے بعد آپ ایک ایک آیت کا ترجمہ لکھتے تھے۔ پھر دوسری آیت لیتے۔ اس کا بھی اسی طرح چکر چلتا تھا...... ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر صبح کے لکھے ہوئے ترجمے پر نظر ثانی فرماتے۔ کبھی حضرت مولانا سلطان محمود، شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ فتح پوری مولانا صاحب سے ملنے تشریف لاتے تو ان کو ملاحظہ کراتے۔ کبھی مولانا اللہ بخش صاحب و مولانا ضیاء الحق صاحب دیوبندی مرحوم، جو مدرسہ امینیہ میں صدر مدرس تھے اور مولانا مولانا مرحوم کے استاد تھے، آتے تو ان کو سناتے۔ کبھی حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی، نائب امیر شریعت تشریف لے آتے تو ان کو ملاحظہ فرماتے۔ کبھی کوئی اور صاحب دیوبند سے تشریف لاتے تو ان کو دکھاتے۔ کوئی صاحب پاکستان سے ملنے آتے تو ان کو بھی دکھاتے۔ غرض اہل علم میں سے جو حضرات بھی کہیں سے تشریف لاتے تو ان کو ضرور ملاحظہ کرلتے تھے۔"

اس طرح انتہائی محنت وجاں فشانی، عرق ریزی اور ژرف نگاہی سے قرآن کریم کے ترجمے کشف الرحمٰن اور تفسیر الرحمٰن وتسہیل القرآن کی تالیف کا کام کیا گیا۔ مولانا نے ترجمہ کا عنوان کشف الرحمان، اس کی مختصر تشریح کا عنوان تیسیر القرآن اور اس کے حواشی جو کافی جامع اور مفصل ہیں ان کا عنوان تسہیل القرآن متعین فرمایا ہے۔ اس کام میں متعدد عربی، فارسی اور اردو تفاسیر سے بھی مدد لی ہے۔ ان کی فہرست بھی سرورق پر دے دی گئی ہے۔ ان میں جلالین، روح البیان، تفسیر کبیر، تفسیر مظہری، مدارک، خازن، ابن کثیر، فتح البیان، بیضاوی، کشاف، تفسیر ابن جریر، بیان القرآن، تفسیر حسینی، اعظم التفاسیر، تفسیر در منثور اور جامع التفاسیر شامل ہیں۔

حضرت سحبان الہند کے ترجمہ کشف الرحمٰن، تفسیر تیسیر القرآن اور حواشی تسہیل القرآن کے طرز بیان، اسلوب نگارش اور انداز توضیح وتشریح کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے چند اقتباسات پیش کر دئے جائیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : شروع اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

ف: اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں، جو بے حد مہربان ہے اور بے انتہا رحم کرنے والا ہے۔

(تیسیر) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس بڑی رحمت والی ہے اور اس کی رحمت ومہربانی بڑی عام ہے۔ میں اس سورۃ کو اسی کے نام کی برکت حاصل کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں تاکہ آداب تلاوت میں کوئی کوتاہی یا سہو ہو جائے یا کسی آیت کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہو جائے تو خدائے تعالیٰ اپنی عام رحمت ومہربانی سے اس کو درگزر فرما دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس اہم اور ذیشان کام کو شروع کرتے وقت بسم اللہ نہ پڑھی جائے تو

اس کام میں کامیابی اور برکت نہیں ہوتی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ : سب تعریفیں اس خدا کو لائق ہیں جو تمام عالموں کا رب ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ : جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ : جو روز جزا کا مالک ہے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ : ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ : اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ : ہم کو سیدھی راہ چلا۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ : ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا فضل کیا ہے۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ : وہ لوگ وہ ہیں جن پر نہ غضب نازل کیا گیا۔

وَلَا الضَّآلِّیْنَ : اور نہ وہ جو راہ سے بے راہ ہوئے۔

(تسہیل) : سب تعریفیں اور حمد وثنا اسی اللہ تعالیٰ کو سزاوار اور لائق ہے، جو ہر ایک عالم کا مربی اور تربیت کرنے والا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ بے حد مہربان اور بے انتہا مہربانی کرنے والا ہے۔ وہ جزا وسزا کے دن کا مالک ہے۔

(تیسیر) : حاصل یہ ہے کہ جو تعریفیں اب تک ہو چکیں یا آئندہ ہوں گی ان سب کا حقیقی مستحق اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ مخلوق میں سے جس چیز کی بھی تعریف کی جائے وہ درحقیقت خدا ہی کی ہے اس لئے کہ مخلوق کی تمام خوبیاں حضرت حق ہی کی مرہون منت ہیں۔ وہی ہر ایک عالم کا خواہ عالم ملائکہ یا عالم جنات وانسان ہو، یا عالم نباتات وجمادات ہو، سب کا وہی خالق اور وہی پرورش کنندہ ہے۔ رب کے بہت سے معنی ہیں، ہم نے یہاں کی مناسبت سے خالق ومربی کر دیا ہے۔

جزا وسزا کا دن قیامت کا دن ہے کیونکہ اس دن ہر برے اور بھلے کو اس کے کئے کا

بدلہ ملنے والا ہے۔ اگرچہ ہر چیز کے حق تعالیٰ ہی مالک ہیں، لیکن چوں کہ وہ دن نہایت ہی اہم اور خوف ناک ہوگا اور اس دن ہر قسم کی حکومتیں اور بادشاہتیں فنا ہو چکی ہوں گی اس لئے اس کی ملکیت وخودمختاری کا ذکر فرمایا کہ اس دن کوئی ظاہری اور مجازی مالک بھی نہ ہوگا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا سب پر مالکانہ تصرف ہوگا۔

سورۂ بقرہ : آیت ۳۰ :

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

کشف الرحمٰن : اور وہ واقعہ قابلِ ذکر ہے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ یقیناً میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا آپ زمین میں ایسے شخص کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد اور خوں ریزی کرے، یعنی اس کی اولاد اور ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح کرتے اور آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا، میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے۔

تسہیل القرآن : وہ واقعہ قابلِ ذکر ہے، جب اے پیغمبرؐ آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ یقیناً میں زمین پر ایک نائب بنانے والا ہوں۔ اس پر فرشتوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین پر ایسے لوگوں کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد کریں گے اور خوں ریزی کے مرتکب ہوں گے، حالانکہ ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح کرتے اور آپ کی تنزیہ وتقدیس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اس کے پیدا کرنے کی جو حکمت ومصلحت میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔

تیسیر القرآن : مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین میں آدم علیہ السلام کو پیدا

کرنا چاہا اور ملائکہ اور جنات کی موجودگی کے باوجود ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا جو دونوں قسم کی استعداد سے متصف ہو اور اس کی طبیعت اصلاح وفساد دونوں کی جانب مائل ہونے والی ہو کیوں کہ ملائکہ میں تو نافرمانی اور فساد کی صلاحیت ہی نہ تھی اور جنات میں اگرچہ اصلاح کی استعداد موجود تھی، لیکن وہ بہت ضعیف تھی۔ اس لئے حضرت حق جل مجدہٗ کو فجور اور تقویٰ دونوں کی استعداد رکھنے والی مخلوق کو نائب اور خلیفہ بنانا تھا، تاکہ وہ زمین میں احکام شرعیہ کا نفاذ اور اجرا کرے اور حدود الٰہیہ کو قائم کرے۔ ....."

حضرت سحبان الہند نے بعض امور سے بہت تفصیلی گفتگو فرمائی ہے اسی طرح بہت سی آیات کے معانی ومفاہیم بھی بڑی شرح وبسط سے بیان کئے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳ کا ترجمہ، تشریح اور معانی ومطالب پیش کئے جاتے ہیں:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

ترجمہ : اور اگر واقعی تم اس کتاب کی نسبت جو ہم نے اپنے خاص بندے یعنی محمدؐ پر نازل کی ہے، کچھ شک ہو تو تم اس جیسی ایک چھوٹی سی سورۃ ہی بنا کر لے آؤ اور تم اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔

فا : اور اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں، جو ہم نے اپنے خاص بندے محمدؐ پر نازل فرمائی ہے، کچھ شک وشبہ ہو کہ یہ ہم نے نازل نہیں کی، بلکہ اس کتاب کو ہمارے بندے نے بنایا ہے تو تم اس کی مثل ایک چھوٹی سی سورۃ ہی بنا کر لے آؤ اور تم اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں اور حمایتیوں کو بلا لو، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اس کتاب کی مثل کوئی چھوٹی سی سورۃ باوجود اپنے حمایتیوں کے بنا کر نہ لائے اور ہم

کہتے ہیں کہ تم اس قرآن کا جواب بنا کر لا بھی نہ سکو گے، تو پھر اس آگ سے بچنے کی کوشش کرو جس آگ کا ایندھن بجائے لکڑی اور کوئلے کے آدمی اور پتھر ہیں اور وہ آگ کافروں اور دین حق کے منکروں کے لئے تیار کی جا چکی ہے۔

تیسیر القرآن : رَیب اصل میں نفس کے اضطراب اور قلق کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب دل میں اضطراب اور قلق ہوتا ہے تو طبیعت کسی ایک بات پر نہیں ٹھکتی اور اسی کو شک کہتے ہیں۔ ہم نے ابتدا میں بتایا تھا کہ کسی چیز میں شک کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس چیز میں واقعۃً شک ہو اور دوسرے یہ کہ کوئی شخص اپنی عقل کی کوتاہی اور ضد سے شک کرے۔ چنانچہ لاریب فیہ میں پہلی صورت کی نفی تھی، اب اس دوسری صورت کی نفی فرماتے ہیں کہ اگر تم کو واقعی اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہے اور تم اس قرآن کو محمدؐ کا خود ساختہ کلام سمجھتے ہو تو تم بھی اس قرآن کی مثل ایک محدود ٹکڑا اور چھوٹی سی سورۃ بنا لاؤ، جو فصاحت و بلاغت اور پند و نصائح اور تاریخ امم ماضیہ اور غیب کی خبروں وغیرہ میں اس قرآن جیسی ہو۔ آخر تم لوگ بھی عربی ہو، عرب کے رہنے والے ہو، عربی زبان سے واقف ہو۔ پھر بھی ہم تمہارے ساتھ اتنی رعایت اور کرتے ہیں کہ تم اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو اور تم سب مل کر ہمارے اس مطالبے اور تحدی کا جواب دو...."

قرآنِ کریم میں جو حروفِ مقطعات استعمال ہوئے ہیں، ان کے بارے میں مختلف مفسرین اور مترجمین نے الگ الگ نقطۂ نظر اپنایا ہے۔ کچھ حضرات نے ان کے معانی و مفاہیم متعین کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن زیادہ تر مفسرین نے محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ ان حضرات کا فرمانا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے درمیان راز ہیں اور چوں کہ کسی مصلحت سے ان کے معانی ظاہر نہیں کئے گئے ہیں، اس لئے ہمیں بھی اس سلسلہ میں اشہب فکر کو دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت

سحبان الہند نے بھی یہی موقف اپنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

" الف۔ لام۔ میم۔ حروف ہیں۔ ان کو **حروف مقطعات** کہتے ہیں۔ تمام قرآن میں یہ حروف ۲۹ سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ کسی صورت کی ابتدا میں صرف ایک ایک حرف ہے۔ جیسے **قاف، نون، صاد** اور کسی سورہ کی ابتدا میں حرف دو ہیں جیسے **طٰہٰ، یاسین** اور کسی سورۃ کی ابتدا میں تین ہیں جیسے **الف۔ لام۔ میم** اور **الف۔ لام۔ را** اور کسی سورۃ کی ابتدا میں ان حروف مقطعات کی تعداد چار ہے جیسے **الف۔ لام۔ میم۔ صاد** اور کسی سورۃ کی ابتدا میں ان کی تعداد پانچ ہے جیسے **کاف ہا، یا، عین صاد** اور **حا میم، عین سین، قاف**۔ بہرحال یہ حروف اللہ تعالیٰ کے اسرار اور اس کے بھیدوں میں سے کچھ ایسے بھید ہیں جن کو وہی خوب جانتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے معنی اور ان کی حقیقی مراد سے اور اس بھید سے جو ان حروف میں پنہاں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا ہو۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس کے معنی سوائے اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہیں جانتا تو پھر علمائے مفسرین نے ان کے معنی کیوں بیان کئے ہیں۔ جواباً گزارش ہے کہ جن حضرات نے ان کے معنی بیان کئے ہیں وہ تخمینی ہیں جو محض تمثیل و تشبیہ کے طور پر بیان فرمائے ہیں اور جو لوگ معنی کی نفی کرتے ہیں اور کچھ کہنے سے انکار کرتے ہیں، وہ حقیقی معنی اور حقیقی مراد کا انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا بیان کرنے والوں اور خدا کے سپرد کرنے والوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اپنی تفسیر[۱۹] میں ان حروف کی تحقیق کے بارے میں قدمائے مفسرین کے سولہ اقوال نقل کئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بمرادہٖ۔"

اس ترجمہ و تفسیر اور حواشی میں گو عام مفسرین کے طرز کی بڑی حد تک پیروی کی گئی ہے تاہم طرز نگارش اور اسلوب بیان عام فہم، سلیس اور شگفتہ ہے۔

چین میں فارسی زبان وادب

مترجمہ جناب محمد امین عامر صاحب ٭

"یہ مقالہ ایرانی مجلہ کلک اور پژوہشگراں میں شایع ہوا تھا، قارئین معارف کی دلچسپی کے لیے اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے" (محمد امین عامر)

ایران اور چین کے سیاسی، اقتصادی اور تمدنی روابط زمانۂ قدیم سے چلے آرہے ہیں، انھی روابط کی وجہ سے چین میں فارسی زبان وادب کی داغ بیل پڑی جس کا بین ثبوت ان تراجم سے ہوتا ہے جو گزشتہ چند برسوں سے ایران کے تمدنی اور ادبی آثار کی شکل میں ہو رہے ہیں۔ یہاں اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ چین کے ایران شناسوں کے ذریعہ جو فارسی زبان سے کماحقہ واقف ہیں بعض ایرانی آثار کا ترجمہ براہ راست فارسی سے چینی زبان میں ہوا اور بعض کو بالواسطہ طور پر مثلاً انگریزی یا روسی سے چینی زبان میں منتقل کیا گیا۔ فارسی زبان وادب سے چینیوں کے ذوق وشوق اور غیر معمولی دلچسپی کا یہ مظہر ہے کہ رباعیات عمر خیام متعدد بار فارسی سے چینی میں منتقل ہوکر طبع ہوچکی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ فارسی کے بہت سے اہم نسخے مثلاً گلستاں وبوستان سعدی، دیوان حافظ، مثنوی شریف اور اس کی شرح چلپی، تفسیر حسینی، اشعۃ اللمعات جامی اور قدیم فارسی قواعد میں محمد بن حکیم الزینی کی تصنیف منہاج الطلب وغیرہ دوبارہ مرتب ہوکر چین کے مختلف فارسی مرکزوں سے اصل زبان میں شایع ہوئیں اور کثیر تعداد میں فروخت ہوئیں۔

٭ ۱۰۱ اپیل خانہ سکنڈ لین۔ ہوڑہ۔

چین کے مسلمانوں کو فارسی زبان سے گہرا شغف ہے اور دینی مدارس میں خصوصیت کے ساتھ اس کے درس وتعلیم کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام فارسی زبان ہی کے ذریعہ چین میں داخل ہوا اس لئے وہ چینی مسلمانوں کو فارسی کی جانب مبذول کئے بغیر نہ رہا۔

اس وقت چین میں فارسی زبان وادب کے فروغ وترقی کی رفتار کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۹۱ء سے اس کی پیش رفت کے لئے ٹیلی ویژن کو موثر ذریعہ بنایا گیا نیز یونیورسٹیوں میں اس کے درس وتدریس کا اہتمام اور فارسی معلموں اور استادوں کی تقرری وتربیت کا بندوبست کیا جاتا ہے' اس کے لئے کمیشن مقرر ہوتے ہیں، علمی وادبی مذاکرے اور سمینار ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں چینی مسلمانوں میں فارسی زبان وادب کے ایسے مایہ ناز شعراً ادبا، نثر نگار اور محققین پیدا ہورہے ہیں جو ایرانی علما، فضلا اور دانش وروں کی نگاہ میں بھی قابل اعتنا سمجھے جاتے ہیں۔

سب سے پہلی فارسی کتاب رباعیات عمر خیام ہے جو بالواسطہ طور پہ انگریزی سے چینی زبان میں منتقل کی گئی۔ ۱۹۲۴ء میں چین کے ایک بزرگ شاعر معاصر گوموژو (۱۸۹۲-۱۹۷۸ء) کے ذریعہ یہ کام انجام پایا۔ ان کی شہرت چین میں شعر نو کے بانی کی حیثیت سے ہے، چنانچہ ان کے اس ترجمہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اسی نے چینی ادب نوازوں کی توجہ عمر خیام کی طرف مبذول کرائی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوچکے ہیں۔

رباعیات عمر خیام کا تازہ ترین ترجمہ پیکنگ یونیورسٹی میں فارسی زبان وادب کے استاد پروفیسر جان ہون نین کے بدست انجام پایا۔ انہوں نے ۱۹۹۱ء میں براہ راست فارسی سے چینی زبان میں رباعیات کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس سے قبل ۱۹۹۰ء میں رباعیات کا ترجمہ

انگریزی سے چینی زبان میں خانم باؤلی نے کیا۔ خانم باؤلی کا شمار چین کے اہلِ فن میں ہوتا ہے اور ان کے اس مقبول ترین ترجمہ پر سال مذکور کو ترجمہ کا بہترین سال قرار دیا گیا۔ پھر اس سے قبل ۱۹۸۸ء میں حکومت چین کے محکمۂ اشاعت کے ایک اہم رکن جان ہوئی نے براہِ راست فارسی سے چینی زبان میں رباعیات کو منتقل کیا اور پھر اسی سال ہان گاؤسین کے بدست انگریزی سے چینی زبان میں رباعیات کا ترجمہ منظرِ عام پر آیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۹۱ء کے دوران پانچ بار بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر رباعیات عمر خیام کو چینی زبان میں منتقل کرنے کی ایک بارآور اور قابلِ قدر کوشش انجام دی گئی جو فارسی زبان و ادب سے چینیوں کے ربط و تعلق کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

ذیل میں فارسی کے چند اہم اور خاص نسخوں کی ایک فہرست دی جاتی ہے جو براہِ راست فارسی سے یا دیگر زبانوں سے چینی زبان میں ترجمہ اور طباعت کے مراحل سے گزرے۔

۱۔ **گلستانِ سعدی**: فارسی کی مقبول ترین کتاب گلستان کا نسخہ ۱۹۴۷ء میں وان جین جای کے بدست انگریزی سے چینی زبان میں منتقل ہوا۔ وان جین جای چین کے ایک بزرگ مسلمان دانشور تھے جن کا شمار ملک کے معروف ماہرِ اسلامیات میں ہوتا تھا۔ پھر ۱۹۵۸ء میں اس کا ترجمہ چینی زبان میں انگریزی کے ذریعہ شوی جان فو نے کیا جو حکومتِ چین کی وزارت فرہنگ کے ایک اہم رکن رہ چکے ہیں۔

۲۔ **بوستانِ سعدی**: گلستان کے بعد بوستاں کا منظوم ترجمہ فارسی سے چینی زبان میں ۱۹۸۹ء میں جان ہون مین کے ذریعہ انجام پایا۔ جن کا تعارف گزشتہ سطور میں کرایا جا چکا ہے۔

۳۔ **برگزیدہ ہای از داستانہای کوتاہ فارسی**: فارسی کی چھوٹی چھوٹی داستانوں پر

مشتمل یہ ایک انتخاب ہے جس کا انگریزی سے چینی زبان میں ترجمہ ۱۹۵۸ء میں پان چین لین نے کیا۔ لین چینی حکومت کی وزارت فرہنگ کے ایک اہم رکن اور معروف دانش مند رہے ہیں جن کی ادبی خدمات چینی رسائل و جرائد میں ثبت ہیں۔

۴۔ **منتخبات آثار صادق ہدایت**: اس کا ترجمہ بھی پان چین لین نے پہلی بار ۱۹۶۲ء اور دوسری بار ۱۹۸۱ء میں روسی اور انگریزی کی مدد سے چینی زبان میں کیا۔

۵۔ **داستان رستم و سہراب**: یہ شاہنامۂ فردوسی سے منتخب شدہ ایک داستان ہے جس کا ترجمہ بھی ۱۹۶۴ء میں روسی سے چینی زبان میں پان چین لین کے بدست انجام پایا۔

۶۔ **پیام آور صبحگاہ**: ملک الشعراء بہار کے منتخب اشعار کا یہ ایک مجموعہ ہے۔ جسے شین ین شون نے ۱۹۶۵ء میں براہِ راست فارسی سے چینی زبان میں منتقل کیا۔ شون بھی چینی حکومت کی وزارت فرہنگ سے منسلک رہ چکے ہیں۔

۷۔ **جہاں گشای جوینی**: اس کا انگریزی سے چینی زبان میں ترجمہ ۱۹۸۱ء میں خہ گاؤلوجی نے انجام دیا۔

۸۔ **برگزیدہ ہای غزلیاتِ حافظ**: حافظ شیرازی کی غزلوں کا یہ ایک انتخاب ہے ۱۹۸۱ء میں براہِ راست فارسی سے چینی زبان میں اس کے ترجمہ کا سہرا شین ین شون کے سر بندھتا ہے۔

۹۔ **داستانہای آفندی**: چین کے ادارۂ علوم اجتماعی کے ایک اہم رکن یوان ون چی نے ۱۹۸۲ء میں فارسی سے چینی زبان میں اس داستان کو منتقل کیا جن کی بیشتر تحقیقات قدیم ایرانی تمدن اور "اوستا" سے متعلق ہیں

۱۰۔ **برگزیدۂ اشعار رودکی سمرقندی**: فارسی کے اولین اور معروف ایرانی

شعرا میں رودکی سمرقندی کا نام ممتاز ہے، اس کے اشعار کا یہ ایک انتخاب ہے، جسے پہلی بار ۱۹۸۲ء اور دوسری بار ۱۹۸۴ء میں فارسی سے چینی زبان میں منتقل کرنے کا شرف جان ہوی کو حاصل ہوا۔

۱۱۔ **نہ کوشک**: ایرانی داستانوں پر مشتمل اس انتخاب کو ۱۹۸۲ء میں انگریزی سے چینی زبان میں پان چین لین نے منتقل کیا۔

۱۲۔ **باغ لالہ**: یہ کلاسیکل فارسی اشعار کا مجموعہ ہے جو پان چین لین کے ذریعہ انگریزی اور روسی زبانوں سے منتقل ہو کر وقتاً فوقتاً چینی رسائل و جرائد کی زینت بنتا رہا ہے۔ لین نے ضرورت کے پیش نظر اسے ایک مجموعہ کی شکل دے کر ۱۹۸۳ء میں طباعت سے ہم کنار کیا۔

۱۳۔ **داستانہای دل انگیز ادبیات فارسی**: یہ ایک ایرانی ادیبہ خانم زہرا خانلری کی تصنیف ہے جسے جان ہون نین نے ۱۹۸۳ء میں چینی زبان میں پیش کیا۔

۱۴۔ **لیلیٰ و مجنون**: معروف ایرانی شاعر نظامی گنجوی کی یہ مثنوی ہے جسے ۱۹۸۳ء میں جان ہون نین نے فارسی سے منظوم چینی زبان کے قالب میں ڈھالا۔ پھر ۱۹۸۹ء میں لوایون فی کے توسط سے روسی سے چینی زبان میں اس کا ترجمہ منظر عام پر آیا۔

۱۵۔ **جامع التواریخ**: یہ رشید الدین فضل اللہ کی تصنیف ہے۔ ۱۹۸۳ء میں انگریزی سے چینی زبان میں اس کو منتقل کرنے کا اعزاز یو واجوین و جو جی چی کو حاصل ہوا۔

۱۶۔ **برگزیدہ داستانہای عامیانۂ ایرانی**: یہ بھی ایک عام ایرانی داستانوں پر مشتمل انتخاب ہے جسے ۱۹۸۴ء میں انگریزی سے چینی زبان میں پیش کرنے کا فریضہ یوان ون چی نے انجام دیا۔

۱۷۔ **برگزیدہ اشعار نظامی گنجوی**: نظامی گنجوی کے منتخب اشعار کا ترجمہ ۱۹۸۸ء میں فارسی سے چینی میں جان ہوی کے بدست انجام پایا۔

۱۸۔ **برگزیدہ از غزلہای کہن فارسی**: قدیم فارسی غزلوں کا یہ ایک انتخاب ہے جو ۱۹۸۸ء میں جان ہون نین کے توسط سے براہ راست فارسی سے چینی زبان میں منتقل کیا گیا۔

۱۹۔ **ختائی نامہ**: علی اکبر ختائی کی یہ تصنیف ہے جس کا ترجمہ فارسی چینی زبان میں جان جی شان اور ان کے رفقائے کار نے ۱۹۸۸ء میں کیا۔

۲۰۔ **منتخبات داستانہای عامیانہ فارسی**: یہ بھی عام فارسی داستانوں کا ایک انتخاب ہے جو تزالوئی کے توسط سے فارسی سے چینی زبان میں منتقل کیا گیا۔

۲۱۔ **سالار شاعران**: فردوسی سے متعلق پان چین لین کی یہ ایک مستقل فارسی تصنیف ہے، جو ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی۔

۲۲۔ **قابوسنام**: یہ قابوسنامہ کیکاؤس بن اسکندر کی تصنیف ہے جسے ۱۹۹۰ء میں فارسی سے چینی میں منتقل کرنے کا سہرا جان ہوئی کے سر بندھتا ہے۔

۲۳۔ **داستانہای برگزیدہ از شاہنامہ فردوسی**: یہ شاہنامہ فردوسی سے منتخب داستانوں کا ایک مجموعہ ہے جو ۱۹۹۱ء میں جان ہون نین کے بدست فارسی سے چینی زبان میں منظوم ترجمہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔

۲۴۔ **برگزیدہ رباعیات فارسی**: شعرائے فارسی کی رباعیوں کا یہ بھی ایک منتخب مجموعہ ہے۔ ۱۹۹۱ء میں فارسی سے چینی زبان میں اس کے ترجمہ کا اعزاز جان ہوی کے حصہ میں گیا۔

۲۵۔ **مجموعۂ ای از آثار ادبیات کہن و معاصر فارسی**: قدیم و معاصر فارسی

کے ادبی آثار کا یہ ایک اہم مجموعہ ہے جس کا ترجمہ ۱۹۹۱ء میں براہ راست فارسی سے چینی زبان میں چین کے ادبا اور محققین کے ایک گروہ نے انجام دیا۔

۲۶۔ تاریخ ادبیات ایران: ایرانی ادب کی تاریخ پر مشتمل دو جلدوں میں یہ ایک جامع اور اہم کتاب ہے جسے ۱۹۹۲ء میں چینی زبان میں تصنیف کر کے جان ہون نین نے حسن قبول حاصل کیا۔

۲۷۔ اساطیر ایران باستان: قدیم ایرانی کہانیوں پر مشتمل یہ ایک تصنیف ہے جو ۱۹۹۲ء میں فارسی سے چینی زبان میں یوان وَن چی کے توسط سے ترجمہ و تالیف کے مرحلہ سے گزری۔

چین میں ایک معرکۃ الآرا کام لغت نویسی کے ضمن میں بھی انجام دیا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں پیکنگ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے اساتذہ اور تہران میں واقع انجمن لغت نامۂ دھخدا، کے تعاون سے فارسی سے چینی زبان میں "فرہنگ بزرگ فارسی بہ چینی" کے نام سے ایک لغت شایع کی گئی۔ پھر ۱۹۹۰ء میں اس کی دوبارہ اشاعت ہوئی اور مذکورہ اداروں کے تعاون سے بڑے اہتمام کے ساتھ لغت مذکور کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ "فرہنگ بزرگ فارسی بہ چینی" فارسی زبان وادب سے متعلق چین میں شایع ہونے والی تصنیفات میں سے ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ جس کی اشاعت پر اب تک اسے دو ممتاز انعامات سے نوازا گیا

چینی مسلمانوں کے دینی مراسم: سرزمین چین میں فارسی زبان وادب کی جڑیں بتدریج پیوست ہوتی چلی گئیں، اس کا ایک نمایاں اثر یہ دیکھنے میں آیا کہ فارسی زبان چینی مسلمانوں کی [illegible]بی زبان کی حیثیت سے متعارف ہونا شروع ہوئی چنانچہ دینی رسوم کی ادائیگی کے وقت

چینی مسلمانوں میں فارسی زبان کے الفاظ کا استعمال عام ہوگیا۔ نماز سے قبل اذان کے لئے 'بانگ نماز' اذان دینے کی جگہ کے لئے منارہ کے بجائے 'بانگ جای' اور طہارت کے لئے لفظ وضو کے بجائے خالص فارسی لفظ "آبدست" کا استعمال ان میں عام ہوگیا۔ اسی طرح تمام پنج وقتہ نمازوں اور نماز عیدین کی ادائیگی کے وقت ان کی نیتیں بھی وہ فارسی زبان ہی میں کرنے لگے جس کی بین دلیل مختلف نمازوں سے متعلق فارسی زبان میں نیت ناموں پر مشتمل بازاروں میں دستیاب کتابیں ہیں جن میں اندرون نماز پڑھے جانے والے اذکار اور ادعیہ کے عربی متن کے بین السطور فارسی میں ان کے معانی بھی درج ہیں۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر زوجین کے درمیان ایجاب وقبول فارسی زبان ہی میں کرائے جاتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فارسی زبان کس قدر چینی مسلمانوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔

چین کا ایک گاؤں 'دہ پارسی': چین کے جنوب میں "دہ پارسی" کے نام سے چھوٹے دریاؤں اور نہروں کے بیچ میں ایک معمولی سا چھوٹا گاؤں آباد ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چاول کے کھیت اور کاج کے درخت ہیں جن کی پتیاں نہایت باریک اور لمبی اور تنے بالکل سیدھ میں ۳۰ میٹر کی بلندی تک پہنچے ہوتے ہیں اس کے علاوہ اس گاؤں میں سرسبز وشاداب باغ ہیں، جن میں لمبے، مغزدار اور خوش رنگ بانس کی پیداوار ہوتی ہے جو بالکل راست اور متساوی الساقین ۲۰ میٹر تک لمبی چلی گئی ہے۔ اس کے پتے لمبے اور خرمہ کی شکل کے ہوتے ہیں اور تنوں سے لاٹھی اور نیزے بنائے جاتے ہیں۔ نہروں اور دریاؤں میں بطخوں اور مرغابیوں کی اچھل کود بڑا دل کش منظر پیش کرتی ہے۔ اس گاؤں کے تعلق سے یہ چیز بہت ہی غیر معمولی اہمیت کی حامل اور قابل توجہ ہے کہ اس کا نام ایرانی طرز پر ہونے کے علاوہ وہاں کے باشندوں کے سماجی رسم ورواج

قدیم ایرانی تہذیب و تمدن کی چھاپ زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ بلاشبہ گاؤں کے باشندوں کی اکثریت جو تجارت پیشہ ہے پارسی النسل ہے جن کے آبا و اجداد نے ایران سے مہاجرت کر کے تانگ (TANG) کے زمانہ میں (۶۱۸ - ۹۰۷ء) چین کے اس گاؤں میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔

مذکورہ گاؤں کے باشندوں کے دینی مراسم ان کے اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد پر انجام پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ عبادت و بندگی کے ارکان، مردوں کے مراسم تدفین اور بطور تعزیت میت کے اہل خانہ کو تحائف دینے کی رسم سونے کے بنے ہوئے ۲ بالمقابل مجسموں کے سامنے انجام دی جاتی ہے جو ان کے عقائد کے مطابق ان کے ۲ خداؤں کے مظہر ہیں۔ ایک نیکی کا خدا جس کا نام پرسا (PERSIA) ہے جس کی صورت بہت ہی مشفقانہ اور معصوم سی ہوتی ہے اور دوسرا بدی کا خدا ہے جو ایک دیو ہے اور جس کا نام لون گیان (LONG QUIANG) ہے۔ ان کی ناکیں بالکل سیدھی اور لمبی اور آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی ہوتی ہیں اور مونچھیں دراز۔ ہر ایک کے سر پر ایک برتن ہوتا ہے جس میں شمع روشن رہتی ہے۔ سولہ ۱۶ افراد پر مشتمل ایک گروہ کے توسط سے قوانین جاری کئے جاتے ہیں۔ اس گروہ کا سرپرست ایک لمبی اور سیاہ چادر میں ملبوس نظر آتا ہے جس کے سر پر ایک سیاہ نوکدار ٹوپی ہوتی ہے۔ طویل المدت رسم کی ادائیگی کے دوران ڈھولک پیٹا جاتا ہے۔ گاؤں کے قبرستانوں کی شکل تلوار کے نیام کی مانند یا چین کے قدیم دیگوں کے مشابہ ہوتی ہے جس میں ۲ حلقے جڑے ہوتے ہیں۔

اس گاؤں کے باشندوں کی شکل و شباہت بھی ایرانیوں جیسی ہوتی ہے۔ چین کے دوسرے علاقوں سے نسبتاً بہت امتیاز رکھتی ہے۔ گاؤں میں ۶۷ خاندان ایسے ہیں جن کا تعلق نایو (NAIYU) خاندان سے ہے۔ یہ نکتہ بھی عمومی طور پر قابل قبول ہے کہ بہت زمانہ قبل "دہ پارسی" کو چینی بندرگاہ کی حیثیت حاصل رہی ہے جہاں پارسیوں کے جہاز لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ اس گاؤں کے ایک باشندہ وان شاؤ سان (WANG SHAOXIANG) کے قول کے مطابق اس کے آبا و اجداد نے تقریباً ۱۳۶۹ء میں سوجو (SUZHOU) سے نقل وطن کر کے "دہ پارسی" میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آج اس گاؤں کا شمار چین کے ترقی یافتہ شہروں میں ہوتا ہے۔

معارف کی ڈاک

مولانائے محترم نے مندرجہ ذیل گرامی نامہ اپنی وفات سے ایک ماہ ایک روز قبل لکھا تھا جو محکمۂ ڈاک کی مہربانی اور حسن انتظام سے اس ناچیز مکتوب الیہ کو لکھنے کے ڈیڑھ ماہ بعد ملا، مکتوب گرامی کے آخر میں جس تمنائے ملاقات کا اظہار ہے اگر وہ نامہ وقت سے ملا ہوتا تو ممکن تھا کہ نیازمند ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا ہوتا۔ ض۔

لکھنؤ

۲۱ / ۸ / ۱۴۲۰ھ

محبی عزیز و فاضل مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب زید لطفہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ عنایت نامہ مورخہ ۲۶ / نومبر مل کر باعث سرور ہوا، آپ نے اس خدمت کو بڑی اہمیت دی جو دارالمصنفین کے سلسلہ میں کی تھی[۱]۔ یہ اس عظیم ادارہ کا حق ہے، اللہ اور بھی توفیق عطا فرمائے۔

کتاب[۲] پر جو صاحب نظر ثانی کر رہے تھے وہ سفر پر گئے ہوئے ہیں، وہ آئیں گے تو انشاء اللہ جلد کام مکمل کر لیں گے اور کتاب آپ کو بھیج دی جائے گی۔

صحت کی کمزوری کی وجہ سے شاید رمضان لکھنؤ میں کیا جائے، معالجین کا مشورہ ہے، اللہ تعالیٰ مستقبل قریب میں آپ سے ملائے۔

والسلام مع الاکرام
دعا گو
ابوالحسن علی ندوی
۳۰ / نومبر ۱۹۹۹ء

---

[۱] مولانا نے سلطان برونائی سے ملنے والی رقم سے ۲۵ ہزار روپے مرحمت فرمائے تھے، یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

[۲] مولانا کے والد بزرگوار کی تصنیف الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے اردو ترجمہ کی طرف اشارہ ہے۔ ض

۲۵ فروری سنہ۲۰۰۰ء

مکرمی ! السلام علیکم

مولانا علی میاں پر آپ کے "شذرات" میں عربی کا یہ شعر :

اذا عونی وای فتی اضاعوا لیوم کریھۃ وسداد ثغر

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی زبانی کہتے ہوئے موت کی آغوش میں چلے جانا کچھ مسامحت پر محمول کرنا پڑے گا۔

قاعدہ سے تو یہ موقع ع "فقد ناہ وای فتی فقدنا" کا ہے؛ اضاعت کا مفہوم نہ تو حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی شخصیت و منزلت سے میل کھاتا ہے نہ ہی حضرت کے مادحین اور عقیدت مندوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

پھر بھی یہ مسامحت ہی ہے، قابل گرفت غلطی بہ ہر حال نہیں ہے۔ بے تکلف یہ بات لکھ دی ہے۔ امید کہ اسے خردہ گیری کے خانہ میں جگہ نہ دیں گے۔

والسلام: عبدالقدوس رومی

مفتی شہر، شاہی مسجد۔ آگرہ۔

کراچی

۱۴ جنوری سنہ۲۰۰۰ء

محترم ضیاء الدین صاحب ! سلام مسنون

مولانا علی میاں کی وفات کے بعد سے آپ کو خط لکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھوں موت العالم موت العالم کے مصداق مولانا کا انتقال عالم انسانی کا سانحہ عظیم ہے۔ وہ ملت کا نگہبان اور ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے۔ ان کی ساری زندگی علم و عمل کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ آپ کے شذرات کا انتظار ہے۔

نیازمند : خورشید نعمانی

تلخیص و تبصرہ

اسامہ بن منقذ کی کتاب "المنازل والدیار" کی گمشدگی اور بازیابی

از کلیم صفات اصلاحی

مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق کے اپریل ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں استاذ عیسیٰ فتوح کا مضمون شایع ہوا تھا، قارئین معارف کی دلچسپی کے لئے اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ مترجم

میری معلومات کی حد تک اسامہ بن منقذ الکنانی (م: ۱۰۹۵ء - ۱۱۸۸ء) نے کتاب الاعتبار کے علاوہ کوئی کتاب نہیں چھوڑی تھی جس کا انگریزی ترجمہ لبنانی مورخ ڈاکٹر فلیپ ہٹی نے تحقیق و تحشیہ کے بعد شایع کیا ہے۔ لیکن اب روسی مستشرق کراتشکوسکی نے اس کی دوسری کتاب "المنازل والدیار"[1] کا انکشاف کیا ہے کہ وہ روس میں ہے۔ جس کی نقل سید روسو نے حلب سے بہم پہنچائی ہے جو وہاں کے سفیر تھے اور جس کی وہ تحقیق و اشاعت کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

ایک طویل عرصے کے بعد ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر وہیب طنوس نے اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "الوطن فی الشعر العربی" تیار کیا جس میں عربی و غیر عربی مصادر کے مستند حوالوں سے انہوں نے اسامہ بن منقذ کی زندگی اور اس کے شعر و ادب کا جائزہ لیا ہے؛ جس میں اسامہ کی کتاب "المنازل والدیار" کو

[1] اسامہ بن منقذ کثیر التصانیف تھے ان کی مزید کتابوں کے لئے معارف دسمبر ۱۹۹۰ء میں پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ اور ستمبر ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کے مضامین دیکھے جائیں؛ دمشق کا یہ رسالہ پہلے المجمع العلمی العربی کے نام سے شایع ہوتا تھا، اس کے جولائی ۱۹۲۵ء کے شمارے میں بھی کتاب المنازل والدیار کا ذکر ہے (مترجم)

بنیادی ماخذ بنایا گیا ہے۔

ڈاکٹر طنوس نے اسامہ بن منقذ کی جن تالیفات کا تذکرہ کیا ہے، ان میں ۱۲۵۰ اوراق پر مشتمل "المنازل والدیار" بھی شامل ہے۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا کا منفرد مخطوطہ ہے اور لینن گراڈ کے اورینٹل اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ میں محفوظ ہے۔ کتاب میں ۱۶ فصلیں ہیں اور ہر فصل میں کچھ اشعار اور کچھ نثری عبارتیں ہیں جو اس فصل کے عنوان کے لحاظ سے درج کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر وصیب طنوس نے اس کتاب کے موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ یہ کتاب ایسے اشعار سے بھری پڑی ہے جو غم واندوہ، مصائب وآلام، جدائی وفراق اور ٹیلوں پر آہ وبکا اور گریہ وزاری کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ اس میں نثری حصہ کم ہے۔ ڈاکٹر طنوس کی وضاحت کے مطابق اس کتاب کی تالیف کی اصل محرک مولف کی اپنی ذاتی حالت تھی۔ اس کو شدید غم واندوہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے اہل وعیال زلزلہ میں تباہ ہوگئے۔ اس آفت ناگہانی نے نہر عاصی پر واقع حماۃ کے قریب قلعۂ شیزر کو تہس نہس کر دیا۔ قلعہ کے سارے لوگ تباہ ہوگئے۔ یہ کتاب اسامہ بن منقذ کے غم واندوہ کی صدائے بازگشت اور اس کے احساسات کی پرسوز انداز میں ترجمانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولف نے اس کتاب میں خارج از بحث موضوعات پر اعتماد کیا ہے اور متعدد ثانوی موضوعات در آئے ہیں جن کا کتاب کے بنیادی مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر طنوس نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کتاب کی اصلی قدر وقیمت یہ ہے کہ یہ بارہویں صدی عیسوی یعنی چھٹی صدی ہجری کے ادب کی آئینہ دار ہے اور اس چیز نے اس صدی کے ادب کے مطالعے میں اس کو ایک اہم مرجع کی حیثیت دے رکھی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب اس عہد کی ادبی روح کہی جاسکتی ہے۔ نیز اسامہ بن منقذ کی شخصیت کو بھی یہ کتاب آشکارا کرتی ہے۔ ڈاکٹر طنوس کا خیال ہے کہ اس کتاب کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ یہ بہت متنوع اور اہم مواد پر مشتمل ہے جو اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے منفرد ہے اور اس لائق ہے کہ عربی شاعری کے ادبی موضوعات کی اساس قرار پائے۔ اس لئے کہ اس میں تقریباً ۸ ہزار عربی اشعار ہیں جن میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خود ان شعراء کے دواوین میں نہیں ملتے۔ دوسرے ان کا انتخاب ایک بلند پایہ ادبی ذوق اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا احساس دلاتا ہے۔ بایں طور یہ کتاب عربی ادب کے مشہور شعری مجموعوں حماسہ اور امالی کے ہم پلہ اور ان کے مشابہ قرار دی جاسکتی ہے۔

اسامہ بن منقذ کے ہاتھ سے مرقوم اس بے بہا مخطوطہ کی بازیافت کا قصہ کراتشکوفسکی (۱۸۸۲ء-۱۹۵۱ء) نے اپنی کتاب مع المخطوطات العربیہ میں تحریر کیا ہے اور اس واقعہ کے ذکر کے وقت اس پر خوشی کی جو کیفیت طاری رہی اس کا بھی اس نے اظہار کیا ہے جس وقت اس کو یہ مخطوطہ ہاتھ لگا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ مخطوطہ جنیوا سے شام "روسو" نامی شخص کے پاس پہنچا جس کا تعلق شہرۂ آفاق فرانسیسی صاحب قلم جان جاک روسو کے خاندان سے تھا۔ "روسو" نے شام میں بہت اچھی زندگی گزاری اور بہت ساری دولت اکٹھا کی۔ فرانسیسی انقلاب کے برپا ہونے کے وقت اس کا بیٹا حلب و بغداد میں جنیوا کی حکومت کا سفیر تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے پوتے کی تربیت فرانسیسی تہذیب وثقافت کے زیر اثر ہوئی۔ اس نے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں مہارت حاصل کی اور اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ تاجر اور سفیر ہوگیا اور حلب میں ایک لمبی مدت تک رہا جو اس زمانے کا اہم ثقافتی مرکز تھا۔ اسی بنیاد پر اس کے ادبی ذوق کی نشو ونما ہوئی اور اس کے دل میں مخطوطات جمع کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، رفتہ رفتہ اس کے پاس مخطوطات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا ہوگیا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعد میں اس کی مالی حالت اچھی نہ رہی۔ چنانچہ اس نے ۱۸۱۵ء میں

اپنی تمام خریدشدہ کتابیں اور مخطوطات فروخت کرنا چاہا۔ سب سے پہلے اس نے فرانسیسی حکومت سے پیش کش کی۔ تاہم فرانس نے اس کی بھاری قیمت کی وجہ سے لینے سے انکار کر دیا۔ دوسرے اس سے قبل نپولین کی جنگ ہوچکی تھی جس کی وجہ سے فرانسیسی حکومت کا بجٹ بھی متحمل نہیں تھا۔ چنانچہ جب اس کی اطلاع فرانسیسی مستشرق سلفستر دی ساسئی کو ملی تو اس نے اپنے دوست سیدا وفا روف کو جو اس وقت روس میں وزیر تعلیم تھے بتایا۔ انہوں نے خریدنے کی آمادگی ظاہر کی اور اس کو دو مرتبہ میں خریدا، پہلی مرتبہ ۱۸۱۹ء اور دوسری مرتبہ ۱۸۲۵ء میں۔ اس طرح حکومت فرانس اس قیمتی مجموعہ سے محروم ہوگئی اور روس اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور عالمی ایشائی میوزیم کی اس کو زینت بنایا۔

پھر کراتشکو نے روسو کے ان مخطوطات کی اہمیت وافادیت پر طویل بحث کی ہے جو حلب سے پیٹرسبرگ منتقل کئے گئے تھے اور جن کو اس نے قیصر روس کے ہاتھ بیچا تھا۔ ان مخطوطات میں "المنازل والدیار" ہے جو کہ اس مجموعہ کتب میں ہاتھ آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"جب میکسم گورکی نے عالمی ادب ولٹریچر کی نشر واشاعت کا مرکز قائم کیا اور اس نے مستشرقین کو اہم اور طویل المقاصد کاموں کے لئے پہلی مرتبہ اکٹھا کیا تو ترجمہ کے لائق عربی کتابوں کے سلسلہ میں ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا، اس میں اسامہ بن منقذ کی "کتاب الاعتبار" بھی شامل تھی۔ اسامہ بن منقذ صلیبی جنگوں کے زمانہ کا شہسوار اور شکاری تھا۔"

ابن منقذ کی کتاب "المنازل والدیار" سے کوئی بھی مستشرق واقف نہیں تھا بجز "فرین" کے جس نے اس کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا تھا۔ فرانسیسی مستشرق "دیرانبورغ" جس نے اسامہ بن منقذ کی تصنیفات کے مطالعہ میں تقریباً اپنی نصف زندگی ختم کر دی اس کو بھی اس مخطوطہ کا کوئی علم نہیں تھا جو خود مولف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جب کہ وہ ۷۰ سال کا تھا۔"

یہ مخطوطہ کیسے دستیاب ہوا؟ کراتشکوفسکی کی آنکھیں جب اس نادر مخطوطہ کی دید سے روشن ہوئیں جو ایشیائی

میوزیم میں موجود تھا تو اس پر پہلی کیفیت یہ طاری ہوئی کہ "میرے ہاتھ کانپ اٹھے اور مجھ پر رعب طاری ہوگیا۔ جب میں نے اس جلد کو کھولا تو میں خیالوں میں گم تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں اس میں ان سطروں کو دیکھوں جو سلطان صلاح الدین ایوبی اور شیر دل ریچرڈ کے بارے میں ان دونوں کے معاصر کے قلم سے ہے جو پہلے کا دوست اور دوسرے کا دشمن تھا۔"

کراتشکوفسکی نے سیاہ جلد والے مخطوطہ کو کھولا اور نہایت بے تابی کے ساتھ اس کے اول و آخر پر نگاہ ڈالی لیکن اس کو بہت ناکامی اور مایوسی ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے شروع کا حصہ ناقص اور آخر کا حصہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس کے شروع کے حصہ کی کتابت بہت بعد کے زمانہ میں ہوئی جو کہ دوسرے خط میں جدید اوراق پر لکھا ہوا تھا۔

اسامہ بن منقذ کی صراحت کے مطابق اس نے اپنی یہ کتاب (المنازل والدیار) ۷۰ سال کی عمر میں اپنی زندگی کے اواخر میں تصنیف کی تھی۔ اس میں اس کے ان تمام اہل خاندان کے مرثیے تھے جو ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں قلعہ شیزر میں ہلاک ہوگئے تھے۔ بنی منقذ کے خاندان کا کوئی شخص جو اس قلعہ میں تھا بچا نہیں تھا۔ اسامہ اور اس کا لڑکا جو اس قلعہ سے دور تھے بچ گئے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ میری خانماں بربادی نے مجھ کو یہ کتاب ترتیب دینے پر آمادہ کیا۔ اس لئے کہ زمانے نے میرے شہر و وطن پر آفت ڈھائی۔ وہاں کے مکانات اور اس کے باشندے تباہ ہوگئے۔ اس کی منزلوں کے نشانات رہ گئے اور وہاں کی خوشیاں حسرتوں، نامرادیوں اور رنج وغم میں تبدیل ہوگئیں اور جب مجھے زلزلہ کی ستم ظریفی کے بعد اس کا علم ہوا تو میں اپنے اور اپنے قرابت داروں کے مکانات پہچان نہ سکا میرے اوسان خطا کر گئے اور میں اس عظیم مصیبت اور اپنی عیش وراحت کے سلب سے خدا کی پناہ مانگنے لگا۔ یہ اتنا سنگین حادثہ تھا جس نے مجھ کو آنسوؤں میں ڈبو دیا۔

اسامہ بن منقذ نے زلزلہ کے فوراً بعد "المنازل والدیار" تالیف نہیں کی بلکہ پندرہ[15]

سال کے وقفہ کے بعد جب اس کا نفس مطمئن ہوا اور اس کے حواس پوری طرح درست ہوئے تو اپنی کبرسنی میں یہ کتاب تصنیف کی۔ جب کہ اس کی معرکہ آرائی اور شکار بازی کا دور بھی ختم ہو چکا تھا۔

قلعہ کیفا (جو کہ دیار بکر اور جزیرۂ ابن عمر کے درمیان نہر دجلہ کے پُر فضا مقام پر واقع ہے) میں جب امیر فخر الدین کی میزبانی میں اسامہ کو ایک خوشگوار زندگی گزارنے کا موقع ملا تو اس نے وہاں متعدد کتابیں تالیف کیں۔ مورخین کے اعداد و شمار کے مطابق اس نے تقریباً ۱۳ کتابیں شعر، بلاغت، تاریخ وغیرہ مختلف موضوعات پر لکھیں۔ ان کتابوں میں خاص اہمیت کی حامل "کتاب المنازل والدیار" ہے جو معتدبہ اشعار اور ایسے نثری ٹکڑوں پر مشتمل ہے جن میں تمثیلی، رمزیاتی واشاراتی قصے اور روایتیں ہیں۔ یہ تمام اشعار عزیز وطن کے فراق و بربادی کی وجہ سے پُر درد و غم انگیز نالوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کتاب اسامہ بن منقذ کے غمگین حواس اور اس کی بے اطمینانی و انتشار کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ اسامہ نے اپنی کتاب "المنازل والدیار" میں اپنے خاندان اور اپنے وطن شہر شیزر کا ماتم نہایت پُر درد و غم ناک لہجے میں کیا ہے۔ ایک شعر میں کہتا ہے:

"اے کبوترو! تم کو غم و اندوہ نے برانگیختہ نہیں کیا۔ حالانکہ ہم میں جو غم خوار ہیں وہ رو پڑے تو انھوں نے کہا۔ صبر کر یعنی ہم کس پر آنسو بہائیں۔ (وہ یہ کہہ کر اڑ گئیں)، اور جب میں ان کے غم میں تنہا ہوا تو میرے آنسو جاری ہو گئے اور میں کبھی بھی ان کے غم سے آزاد نہیں ہو سکتا۔"

اسامہ کا بیٹا مرھف صلاح الدین ایوبی کے ہم نشینوں میں تھا۔ ممکن ہے اسی کے واسطے سے اس نے اسامہ کو ۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء میں دمشق بلایا ہو۔ اسامہ کے آنے پر صلاح الدین نے اس کا اعزاز کیا اور اس کے ساتھ بڑے لطف و کرم کا معاملہ کیا اور اس کی کفالت کے لئے معرہ کے اطراف میں اس کے نام کچھ جاگیریں کر دیں اور دمشق میں بھی اس کو کچھ املاک مہیا کئے۔ اس کو اپنا مشیر بنایا۔ چنانچہ

جب وہ فرنگیوں سے برسر پیکار ہوتا تھا تو اسامہ بن منقذ سے جنگی اطلاعات کے سلسلہ میں مراسلت بھی کرتا تھا۔ اسامہ دمشق میں رہنے لگا۔ اس نے وہاں کے مدرسوں میں تدریسی خدمت بھی انجام دی۔ یہاں قیام کی وجہ سے دمشق کی علمی مجالس سے اس کے تعلقات استوار ہوئے۔ پھر صلاح الدین سے بدمزگی کے نتیجہ میں اس سے الگ بھی ہو گیا اور اسی حالت میں ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں اس کا وقت آخر آ گیا اور نہر یزید کے شمالی جانب کوہ قاسیون کے دامن میں اس کی تدفین ہوئی۔ اس کا مقبرہ ابن خلکان کے زمانہ تک معروف تھا۔

کراتشکوفسکی لکھتا ہے کہ اسامہ بن منقذ اپنے ساتھ قلعہ کیفا سے دمشق ایک بڑا کتب خانہ لایا تھا۔ اسی طرح جب اس نے مصر سے شام کا سفر کیا تو اس وقت بھی اس کے ساتھ بہت ساری کتابیں تھیں لیکن یہ ساری کتابیں سمندر میں اور ساری چیزوں کے ساتھ ضایع ہو گئیں۔ ان کتابوں کی غرق آبی کا زخم تادم حیات مندمل نہیں ہوا۔ کتاب "المنازل والدیار" ان کتابوں میں تھی جو وہ حصن کیفا سے لا کر دمشق لایا تھا۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت : دار المصنفین اعظم گڈھ	پتہ : دار المصنفین، اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت : ماہانہ	نام پبلشر : " " "
نام پرنٹر : عبد المنان ہلالی	ایڈیٹر : ضیاء الدین اصلاحی
قومیت : ہندوستانی	قومیت : ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ دار المصنفین

میں عبد المنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ عبد المنان ہلالی۔

ادبیات

قطعۂ تاریخ وفات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

از ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی ٭

بوالحسن، آن مفکرِ اسلام — چونکہ بیرون ز بزمِ یاران رفت

حیفا خورد قلبہای حزین — خواب از دیدہ ھای حیران رفت

خونہا ریخت چشمِ پاکدلان — چون سرِ شان ز پیشِ چشمان رفت

نالہ سر داد جمعِ دانایان — چونکہ آن شاہِ ژرف بینان رفت

ہم عرب، ہم عجم گریست براو — آنکہ سوی بہشت خندان رفت

در و دیوارِ ندوہ گفت کہ آہ! — رونقِ بزمِ اہلِ ایمان رفت

واقفِ نکتہ ہای شرعِ مبین — کاشفِ رازِ ھای عرفان رفت

آن امامِ مفکرانِ زمان — سرورِ مجمعِ ادیبان رفت

رازدانِ زبان و فکرِ عرب — پاسدارِ علومِ قرآن رفت

آنکہ مثلش نبود در کشور — ہم زباندان و ہم سخنران رفت

آن نویسندۂ شہیرِ جہان — آن حبیبِ کتاب خوانان رفت

حق پرستان و حق پژوہان را — دادہ درسِ حدیث و قرآن رفت [1]

بنوشتہ ظواہر و اسرار — از عروج و زوالِ کیہان رفت [2]

٭ کوکو کالونی۔ نئی آبادی۔ علی گڑھ۔

آنکہ از فتنہ ھای قوم و وطن — کرد تحذیرِ مصر و ایران رفت [3]

چہرہ ھای عزیمت و دعوت — روی قرطاس کردہ رخشان رفت [4]

از نبیؐ و شہیدؒ و ہم صدیقؓ — شرح دادہ بہ چند عنوان رفت [5]

صحبتِ اہلِ دل خوشش آمد — کردہ شرح حدیثِ پنہان رفت [6]

صیتِ مرگش بہ ظرفِ ساعتی چند — تا بہ اقصای جملہ کیہان رفت

خبرِ این فجیعہ چون ناگاہ — بہ رئیسِ رہینِ احزان رفت

باسرِ "آہ" گفت تاریخش — "حیف آن پیشوای دوران رفت"

۱۴۲۰ھ = ۱ + ۱۴۱۹

(۱۴۲۰)

شبلی کے فکر و فن کا نگہباں نہیں رہا

از جناب وارث ریاضی صاحب ٭

جہد و عمل کا مہرِ درخشاں نہیں رہا — سوز و گدازِ قلب کا ساماں نہیں رہا

وہ یادگارِ بزمِ سلیماں نہیں رہا — شبلی کے فکر و فن کا نگہباں نہیں رہا

وہ مرجعِ طریقت و احساں نہیں رہا — روحِ روانِ محفلِ عرفاں نہیں رہا

٭ کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج۔ مغربی چمپارن۔ بہار۔

حواشی

[1] مولانا کی کتاب "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی" [2] "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" [3] "اسمعی یا مصر" اور "سخنانی چند با برادران ایرانی" [4] "تاریخ دعوت و عزیمت" [5] "نبی رحمت"، "قصص النبیین"، "سیرت سید احمد شہید" اور "ردۃ ولا ابابکر لہا" [6] "صحبتی با اہل دل"۔

اسلام کے علوم و معارف کا ترجمان
رمز آشنائے سنت و قرآں نہیں رہا

صد حیف وہ مورخ عالم چلا گیا!!
سیرت نگار محسنِ انساں نہیں رہا

وہ عارفِ سنائی و رومی کا راز داں
اقبال کا وہ مردِ[1] مسلماں نہیں رہا

چھیڑے گا کون مہر اخوت کا زمزمہ
انسانیت کے درد کا درماں نہیں رہا

بزمِ ادب تھی جس کے تخیل سے مستنیر
وہ جلوہ زارِ کیف بہاراں نہیں رہا

اے خامہ! غم فشاں کہ نہیں صدحیف قلم
اے نطق اشک ریز کہ سحباں نہیں رہا

وارث بہارِ گلشنِ قوم و وطن نماند

بر ختم دو ہزار سدہ بوالحسن نماند
۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء

قطعاتِ تاریخِ وفات
حضرت مولانا علی میاں ندوی مرحوم

از جناب قمر سنبھلی صاحب٭

(۱)

جناب شیخ ندویؒ دارِ فانی سے ہوئے رخصت
سفینہ آہ! ملت کا ہوا ہے آج بے ساحل

قمر نے جس گھڑی کی فکرِ سالِ صدمۂ جاں کاہ
ندا یہ غیب سے آئی "مجد خلد میں داخل"
۱۴۲۰ ہجری

(۲)

اک سرپرست، محسنِ ملت کو کھو کے آج
ہے ان کے غم میں عالمِ اسلام نوحہ خواں

---

[1] استاذ محترم ماہر القادری مرحوم نے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کو اقبال کے مرد مومن کا مصداق لکھا ہے۔

٭ ۵۵۰۲۔ نئی سڑک، دہلی۔

لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے ان کا سا راہبر
عالم کا درد رکھتے تھے سینے میں وہ نہاں

دنیا سے بے نیاز تھے، عقبیٰ کے فکر مند
اسوہ نبیؐ کا ان کے ہر اک فعل سے عیاں

سالِ وفات ملتا ہے یوں بھی کبھی قمر!
ٹکرائی ہیں صدائیں سماعت سے ناگہاں

اہلِ جناں پکار اٹھے "روزہ" کے ساتھ ہیں
۲۱۸
"داخل ہوئے بہشت میں جس دم علی میاں"
۲۱۸ + ۱۷۸۱ = ۱۹۹۹ عیسوی

قطعہ تاریخ وفات

از جناب عبدالقدوس رومی صاحب٭

بوالحسن سید علی ندوی کی رحلت! کیا کہیں؛
بات کہنے کی نہیں ہے گریۂ پیہم کی ہے

ہاتفِ غیبی نے یہ تاریخ بتلائی، کیا
۲۶
موت عالم کی نہیں ہے موت یہ عالم کی ہے
۲۶ + ۱۳۹۴ = ۱۴۲۰ھ

کلیاتِ شبلی (اردو)

یہ علامہ شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ ہے جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ترکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی تھیں اور مختلف اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئی تھیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو بڑی محنت سے اس مجموعہ میں یک جا کر دیا ہے، اس کے شروع میں ان کے قلم سے علامہ کی شاعری پر ایک مبسوط مقالہ بھی ہے۔ یہ نظمیں مولانا شبلی کے شاعرانہ کمالات کا ثبوت اور مسلمانوں کے چہل سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے۔

ضخامت ۱۳۰ صفحے اور قیمت ۲۵ روپے

٭ مفتی شہر۔ ہوٹل آشیانہ۔ مقابل جامع مسجد۔ آگرہ۔

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

ماہنامہ فکر و نظر، برصغیر میں مطالعۂ قرآن

مدیر جناب ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمن، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۹۵، قیمت سالانہ ۲۰۰ روپے خصوصی شمارہ ۲۰۰ روپے، پتہ: ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاسلامی اسلامی یونی ورسٹی، پوسٹ بکس ۱۰۳۵، اسلام آباد ۴۴۰۰۰۔

قریب دو ڈھائی سال پہلے پاکستان کے مشہور علمی و تحقیقی ادارہ تحقیقات اسلامی نے "برصغیر میں مطالعہ قرآن" کے عنوان سے ایک علمی مجلس منعقد کی تھی، زیر نظر خاص شمارہ اسی سمینار کے سولہ مقالات کا مجموعہ ہے، علوم القرآن، اردو تفاسیر و مفسرین اور مخطوطات کے ابواب کے تحت یہ مضامین متنوع اور پُر از معلومات ہیں، ہندوستانی تفسیروں میں ملاجیون، مولانا تھانوی، سرسید، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا مودودی اور پیر کرم شاہ الازہری کی تفسیروں کے خصائص کا خصوصی جائزہ لیا گیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے شاہ مراد اللہ سنبھلی کی تفسیر مرادیہ کا ذکر بھی ہے، ایک مضمون میں بلوچستان کے تراجم و تفاسیر کا اچھا تعارف ہے، حصہ مخطوطات میں ابن عسکر کی التکمیل والاتمام لکتاب التعریف والاعلام کا تعارف ڈاکٹر احمد خاں کے قلم سے ہے، پاکستان کے ایک کتب خانہ مسعود جھنڈیر اسلامیہ کے چند عربی و فارسی مخطوطات سے بھی واقفیت ہوتی ہے، لیکن باب اول زیادہ اہم ہے اس میں برصغیر میں قرآن فہمی کے متعلق چھ سیر حاصل مقالے شامل ہیں،

ڈاکٹر عبدالرشید رحمت نے علوم قرانیہ سے شغف رکھنے والے پندرہ نمایاں حضرات کے انتخاب میں تعجب ہے، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نام نہیں لیا، مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کے ذکر کے باوجود یہ کمی محسوس ہوتی ہے، مقالہ نگار کا تجزیہ متوازن ہے تاہم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے متعلق یہ جملہ غیر ضروری ہے کہ "دور حاضر کے وہ شاید واحد مسلمان فلسفی ہیں جنھیں قرآن کریم اور اس کی تعلیمات پر غیر متزلزل یقین تھا"، اسی موضوع پر ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم کا مضمون بھی محنت و مطالعہ و تحقیق کا اچھا نمونہ ہے۔

ماہنامہ العلم سرسید نمبر

مدیر جناب سید مصطفیٰ علی بریلوی، صفحات ۴۰، قیمت سالانہ ۱۰۰ روپے، فی شمارہ ۳۰ روپے، سرسید نمبر ۴۰ روپے، پتہ: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، شارع سید الطاف علی بریلوی، ا۔ جے ۱/۳۵، ۴، ناظم آباد، کراچی۔ پاکستان۔

مشہور ماہر تعلیم، ادیب و صحافی اور سرسید کے عقیدت مند جناب سید الطاف علی بریلوی مرحوم رسالہ العلم کے ذریعہ قریب نصف صدی تک مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی ترقی و کامرانی کے لئے سرگرم عمل رہے، ان کے انتقال کے بعد جناب سید مصطفیٰ علی بریلوی نے مشکل اور نامساعد حالات کے باوجود اس قیمتی یادگار کو قائم رکھا اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہی کیا، العلم کے ہر شمارے میں تعلیم و تدریس کے مسائل، ممتاز ماہرین تعلیم خصوصاً وابستگان سرسید و علی گڑھ کے متعلق منتخب تحریریں آتی رہتی ہیں، زیر نظر دو شمارے (جنوری تا جون ۱۹۹۸ء) خصوصی نمبر کی شکل میں سرسید کی ہمہ جہت شخصیت کے مطالعہ کے لئے خاص ہیں۔ تعلیم و ادب اور علی گڑھ تحریک کے علاوہ ذات نبویﷺ سے سرسید کی محبت و عقیدت پر ایک عمدہ تحریر بھی ہے، سرسید کے رفیق قریب مولوی سمیع اللہ خاں کے متعلق مضمون بھی پڑھنے

کے لایق ہے، ۱۸۹۲ء میں سرسید نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد کے بیان میں ایک اہم تقریر کی تھی جس کا ایک طویل اقتباس نقل کیا گیا ہے ایک صدی گزرنے کے باوجود ان الفاظ کی اہمیت آج بھی برقرار ہے کہ "... قومی کاموں کو عملی طاقت سے انجام دینا، جب تک کہ قوم میں قومی ہمدردی پیدا نہ ہو، نہیں ہوسکتا مگر افسوس کہ ہماری قوم میں وہی چیز نہیں جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے"۔ ان مضامین کے علاوہ رسالہ کے مستقل موضوعات شلاً وفیات اور نقد و نظر وغیرہ بھی شامل ہیں، سرسید نمبر کے ساتھ العلم کے دو شمارے (جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء) بھی موصول ہوئے جن میں اور مضامین کے علاوہ جناب سید الطاف علی مرحوم کی تعلیمی، ادبی و صحافتی خدمات کے متعلق کئی مضامین ہیں، قارئین خصوصاً تعلیمی تحریکوں اور علی گڑھ کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے لئے اس رسالے کا مطالعہ بلکہ سرپرستی ضروری ہے۔

سہ روزہ دعوت **ہندوستانی مسلمان نمبر حصہ دوم** مدیر جناب پرواز رحمانی

صفحات ۱۶۰، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: سہ روزہ دعوت، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مشہور و موقر اخبار دعوت کی اس خصوصی اشاعت کے پہلے حصہ کا تعارف ان صفحات میں آچکا ہے اب یہ دوسرا حصہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اہم مسائل اور جماعتوں، تحریکوں، اور مدرسوں کے متعلق مفید و جدید معلومات پر مشتمل ہے، مقصد واضح ہے کہ خیر امت کی حیثیت سے مسلمانوں کو ان کا فرض منصبی یاد دلایا جائے، اس سلسلے میں مسلم پرسنل لا بورڈ اور اوقاف کے علاوہ بعض علاقوں میں مسئلہ ارتداد کے متعلق ایسے معلومات پیش کئے گئے ہیں جن سے واقفیت اور باخبری عموماً کم ہے، ایک باب میں اثنا عشریہ اور بوہ... اور

بریلوی حضرات کا تعارف اہل سنت والجماعت کے عنوان سے ہے اور خوبی یہ ہے کہ کسی مسلک کی ترجیح یا اختلافی نظریات سے گریز کرتے ہوئے محض ان کی تاریخ کو صداقت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے، ریاستی اسمبلیوں میں مسلم نمایندگی، ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کا تناسب، مختلف یونیورسٹیوں میں مسلمان اساتذہ کی تعداد اور دینی تعلیمی اداروں کی تفصیل نے اس شمارہ کو مفید تر بنا دیا ہے، ادارہ دعوت کی یہ کاوش مستحسن و قابل قدر ہے۔

ماہنامہ ریاض الجنہ، **مرشد امت نمبر،** مدیر جناب عبدالعلیم ندوی،

صفحات ۲۵۶، قیمت سالانہ ۱۰۰ روپے، اس شمارہ کی قیمت ۵۰ روپے، پتہ: مدرسہ عربیہ ریاض العلوم چوکیہ گورینی، ضلع جونپور۔

گورینی کا مدرسہ ریاض العلوم اب دینی تعلیمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں اس کی وسیع و عریض عمارت، لایق اساتذہ اور عمدہ تعلیم و تربیت دراصل اس کے بانی مولانا شاہ عبدالحلیمؒ کی للہیت، اخلاص اور مسلسل جدوجہد کی مرہون منت ہے، مولانا مرحوم کا دائرہ فیض و افادہ بڑا وسیع تھا، گذشتہ سال ان کا انتقال ہوا تو علماء و مشائخ کی بزم سونی محسوس ہوئی لیکن ان کی یاد اور ذکر کا سلسلہ جاری ہے، یہ خاص نمبر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں ان کے تلامذہ و مسترشدین اور احباب و معاصرین کے نقوش و تاثرات اہل دل کی صحبتوں کے حظ و کیف سے آشنا کرتے ہیں۔

ماہنامہ صراط مستقیم، **شیخ عبدالعزیز بن باز نمبر،** مدیر جناب عبدالہادی العمری، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۹۴، قیمت سالانہ ۲۰ پونڈ، پتہ: ۲۰ گرین لین اسمال ہیتھ، برمنگھم، بی ۹، ۵ ڈی بی یوکے

برمنگھم برطانیہ سے شایع ہونے والا یہ اردو رسالہ مفید و دلچسپ مضامین اور

نفاست و خوبصورتی کے لحاظ سے بڑا جاذب نظر ہے، سعودی عرب کے نامور عالم و بزرگ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی یاد میں یہ شمارہ اس مقصد سے خاص کیا گیا کہ موجودہ اور آیندہ زمانے کے لئے یہ درس و افادیت کا ایک ذریعہ بن جائے، چنانچہ مضامین کے انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ شیخ مرحوم کی دینی، ملی اور اخلاقی زندگی کی اصل اور کامل تصویر سامنے آجائے، مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری مرحوم، حافظ صلاح الدین یوسف، ابوالبیان حماد اور ڈاکٹر صہیب حسن اور دیگر اہل قلم کے مضامین سے مزین یہ شمارہ شیخ بن باز کی بلند پایہ شخصیت کے شایانِ شان خراجِ عقیدت ہے۔

ماہنامہ صوت القرآن حج نمبر، مدیر جناب مولانا عبدالاحد قاسمی تاراپوری، صفحات، قیمت سالانہ ۱۰۰ روپے، فی شمارہ ۸ روپے، پتہ: شاہ وجیہ الدین اکیڈمی، جامعہ ابن عباس بلڈنگ، سکنڈ فلور، سرخیز ڈھال احمد آباد گجرات ۳۸۲۲۱۰۔

گجرات کی سرزمین علم و ادب سے اس نئے رسالہ کا اجراء علوم دینیہ کے احیاء اور اردو سے محبت و تعلق کی نسبت سے بڑا خوش آیند ہے، اس حج نمبر میں قرآن و حدیث اور تاریخ کی روشنی میں حج اور ارض بیت اللہ کے متعلق عمدہ تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک قیمتی تحریر "حج کی حقیقت" کے نام سے اور مولانا سید محمد رابع ندوی کا مضمون "حج تاریخ و مسائل کے آئینہ میں" بھی اس میں شامل ہے، جنت البقیع اور مدینہ منورہ اور مضافات کے نقشے بھی دئے گئے ہیں، اس طرح عام قارئین کے علاوہ یہ عازمین حج کے لئے کارآمد ہے۔

تصوف اور ہندوستانی معاشرہ جرنل مرتب جناب پروفیسر محی الدین بمبئی والا، صفحات ۲۸۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: حضرت پیر محمد شاہ

درگاہ شریف ٹرسٹ، احمد آباد گجرات ۳۸۰۰۰۱۔

درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ کی بعض علمی کاوشوں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، زیر نظر جرنل بھی اسی سلسلے کا حصہ ہے کئی سال پہلے اس ٹرسٹ کے زیر اہتمام تصوف اور ہندوستانی معاشرے کے عنوان سے ایک سیمنار ہوا تھا جس میں ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور دہلی، ممبئی اور احمد آباد کے متعدد فضلاء و محققین نے شرکت کی تھی، زیر نظر جرنل میں ان کے مقالات یکجا کئے گئے ہیں، مدیر معارف کا مقالہ "گجرات و احمد آباد اور ان کے بعد صوفیائے کرام کی علمی و ثقافتی دین" کے عنوان سے ہے، انگریزی حصے میں ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی، ڈبلو او الوف اور ڈاکٹر اسماعیل لالی والا کے مضامین ہیں۔

سالانہ مجلے

مجلہ المنار مدیر جناب ظل الرحمن فائق، پتہ: ندوۃ الطلبہ، جامعہ سلفیہ، ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰۔

جامعہ سلفیہ بنارس کے طلبہ کا یہ سالانہ مجلہ گذشتہ شماروں کی طرح ہونہار طلبہ کے علمی ذوق اور ان کے اساتذہ کی صحیح تعلیم و تربیت کا آئینہ ہے، مضامین میں تنوع ہے عربی انگریزی اور ہندی میں بھی مضامین ہیں، یہ مجلہ تحسین اور حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

کارواں مدیر جناب صغیر احمد، پتہ: اینگلو اردو ہائی اسکول اینڈ جونیر کالج جلگاؤں مہاراشٹر۔

جلگاؤں کا اینگلو اردو ہائی اسکول مہاراشٹر کے نیک نام تعلیمی اداروں میں ہے، معروف ماہر تعلیم و مدرس آموزگار جناب اکبر رحمانی کی نگرانی اور جناب محمد فاروق اعظمی جیسے لائق پرنسپل کی رہنمائی میں یہ اسکول سرچشمہ خیر و فیضان رہا ہے اب ان دونوں حضرات کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد یہ مجلہ ان کے ذکر سے

پڑھ ہے، جناب اعظمی کی مختصر خود نوشت بڑی موثر ہے۔

نئے رسائل

سہ ماہی کوہسار جرنل مدیر جناب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مختصر تقطیع، صفحات ۹۶، قیمت فی شمارہ ۵ اروپے، پتہ: بردہ پورہ، بھاگلپور، بہار ۸۱۲۰۰۱۔

معروف ادیب و عاشق اردو ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ادارت میں شایع ہونے والے اس ادبی رسالے کا مقصد "اردو ادب کے سرمائے میں 'نئے پن' کا اضافہ کرنا" ہے، چنانچہ ہائیکو، پے، ٹرائیکو، تکونی، ترسینی، ترائیلے، دوبیتی، دوہے اور کہہ مکرنیاں وغیرہ بعض جدید شعری ہیئتوں اور تجربوں کی کثرت اس شمارے میں نمایاں ہے، ہالینڈ کے ایک ادیب و شاعر احسان سہگل کے لئے ایک گوشہ خاص کیا گیا ہے، کچھ افسانے بھی ہیں، قارئین کے خطوط کے کالم کی سرخی 'ازلاف' سے بھی نئے پن کی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔

ماہنامہ جام شہود مدیر جناب محمد اعظم خاں قادری، قیمت سالانہ ۸۰ روپے فی شمارہ ۷ روپے، پتہ: ماہنامہ جام شہود، ۶۶۔ بالی گنج سرکلر روڈ، کلکتہ ۱۹ ۷۰۰۰۔

دینی و اصلاحی رنگ نمایاں ہے، زیر نظر شمارہ میں مولانا حشمت علی خاں، مولانا محمد علی جوہر اور امام احمد رضا خاں وغیرہ پر مضامین بھی ہیں۔

ماہنامہ پیام اردو مدیر جناب سعادت احمد، قیمت سالانہ ۱۲۰ روپے، فی شمارہ ۱۰ روپے، پتہ: ماہنامہ پیام اردو ۹۹/۹۶-۱-۲۲، سلطان پورہ، حیدرآباد، اے۔ پی ۵۰۰۰۲۴۔

اس نوخیز رسالے میں غزلوں اور افسانوں کا حصہ غالب ہے، ایک مضمون سرسید پر بھی ہے۔

پندرہ روزہ حق و باطل مدیر جناب حکیم محمد مسیح الدین صدیقی، سالانہ ۱۰۰ روپے، فی شمارہ ۵ روپے، پتہ: ۵۰۰/۵، وارڈ نمبر ۳، گودھنی، ناگپور ۴۴۱۱۱۱، مہاراشٹر۔

دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے مضامین پر مشتمل اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

ع۔ ص۔

مطبوعات جدیدہ

اقوال سلف حصہ پنجم و ششم، مرتبہ مولانا محمد قمر الزماں صاحب، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد، صفحات بالترتیب ۳۳۲ و ۲۸۰، قیمت ۱۳۲ روپے، مکتبہ دار المعارف ۴۶۶/۴۰۷، بخشی بازار، الہ آباد۔ یوپی۔

بے شمار کتابوں میں ائمہ و علمائے سلف کے احوال اور ارشادات و ملفوظات کے بکھرے ہوئے جواہر ریزوں کو چننے اور ایک سلک زریں میں پرونے کے مفید و مبارک سلسلے کی یہ نئی کڑی ہے، اس سے پہلے کے حصوں کا ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، اب اس نئی جلد میں دو حصے یعنی پنجم و ششم شامل ہیں، حصہ پنجم میں مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری سے مولانا اسعد اللہ سہارنپوری تک ۶۲ بزرگان دین کا تذکرہ ہے، ان میں بجا طور پر جناب اکبر الہ آبادی اور اصغر گونڈوی جیسے عارف و صوفی منش شعرا اور چند ایسی نیک خواتین کا بھی ذکر ہے جو اس عصر حاضر میں گویا رابعہ بصریہ تھیں، حصہ ششم میں مولانا قاری محمد طیب سے قاری صدیق احمد باندوی تک ۱۲۵ اہل اللہ کا ذکر ہے، اس بیش قیمت خزینے کی بازیافت آسان نہ تھی، کتابیات کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ وسیع مطالعہ و جستجو کے بعد یہ نعمت ہاتھ آئی ہے ملفوظات و اشعار کے حسن انتخاب، پاکیزگی ذوق اور مفید حواشی نے اس کو اور بھی دل کش و موثر بنا دیا ہے، اس سے پہلے یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ محض اقوال سلف ہی نہیں تذکرۃ الاحیا بھی ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں اس قسم کے مجموعوں سے "مختلف و متفاوت العصر والعمر اور متنوع حالات و ماحول کے اشخاص سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے" یقیناً یہ

کتاب ہر شخص کے مطالعہ و استفادہ کے لائق ہے۔

مولانا احتشام الحق کی آپ بیتی، تحریک جمہوریت پاکستان کا ایک باب،

مرتبہ جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، متوسط تقطیع، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۶، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ شاہد، ۱/۹ علی گڑھ کالونی کراچی ۷۵۸۰۰۔

پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں جن علماء کا عملی سیاست سے گہرا تعلق رہا ان میں مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کا نام نمایاں ہے، ان کی شہرت میں ان کی پرزور خطابت کا خاص دخل ہے، عرصے تک وہ پاکستان میں اسلامی آئین کی تدوین و تنفیذ کی کوششوں کی وجہ سے وہاں کی مذہبی سیاست پر اثر انداز رہے، قدرتاً ان کے بعض سیاسی خیالات سے اختلاف بھی کیا گیا لیکن ان کی اہمیت مسلم رہی، زیر نظر کتاب کے عنوان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مولانا مرحوم کی خود نوشت سوانح ہوگی، لیکن ۳۳۶ صفحات کی اس کتاب میں ان کے حالات صرف ۴۵ صفحوں تک محدود ہیں، باقی حصہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے نظریاتی و انتخابی اختلاف و معرکہ آرائی کی تفصیل ہے، جس کے ناقل و راوی کتاب کے فاضل مرتب ہیں، پاکستان کی اندرونی سیاست اور وہاں کے مسلکی و نظریاتی خلفشار و چپقلش سے تعلق رکھنے والوں کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان ہو سکتا ہے، اس سلسلہ میں ریٹائرڈ ایرمارشل اصغر خاں کا یہ تاثر معنی خیز ہے کہ "اس کتاب سے قاری پر ہماری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے رہنماؤں کے افسوسناک اختلافات واضح ہو جائیں گے اور یہ احساس بھی ہوگا کہ جن لوگوں کو ہمارے سیاسی اور دینی فکر کی رہنمائی کا شوق ہے ان کے درمیان بھی کسی حد تک فکر و عمل کی یک جہتی بہت ضروری ہے"۔

شرح مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فی بیان بعض مصطلحات الحدیث

از جناب مولانا حبیب الرحمن قاسمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۱۰۶، قیمت درج نہیں، پتہ: مرکز دعوت و تحقیق دیوبند یوپی۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور شرح مشکوۃ، لمعات التنقیح کے شروع میں مصطلحات حدیث کے متعلق ایک نہایت مفید مقدمہ بھی ہے جو روز اول سے طالبان حدیث کے درمیان مقبول و متداول ہے، یہ علاحدہ شکل میں اور پھر اردو ترجمے کے ساتھ بھی شایع کیا گیا لیکن اب یہ ترجمے کمیاب ہیں، طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر مراجعت و تصحیح اور سلیس ترجمہ کے ساتھ اب زیر نظر کتاب کی شکل میں اس کو شایع کیا گیا ہے۔ شروع میں شیخ محدث دہلوی کا جامع تذکرہ بھی ہے۔ اس کتاب سے اب استفادہ اور بھی آسان ہو جائے گا۔

اثر انصاری فکر و فن کے آئینہ میں

از جناب ایم نسیم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت، صفحات ۱۹۵، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: نکھار پبلی کیشنز، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن۔ یوپی۔

جناب اثر انصاری، ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں، غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے، لیکن نظم نگاری میں بھی وہ کم نہیں، ان کے متعدد شعری مجموعوں میں ایک مجموعہ نظموں پر مشتمل ہے، وہ اچھے ادیب و نثر نگار بھی ہیں، جس کا اندازہ ان کی تذکرہ سخنوران مئو، 'دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز' اور 'سفر حج کے شب و روز' سے ہوتا ہے، عزلت پسندی اور گوشۂ گمنامی کو ترجیح دینے کے باوجود ان کو شہرت کی نعمت حاصل ہوئی اور ارباب سخن کی بزم میں ان کی کاوشیں قدر و عزت کی نظر سے دیکھی گئیں، ان کی فنی خوبیوں کا

اعتراف اہل نظر نے کیا، لایق مرتب نے اچھا کیا کہ ایسی تمام تحریریں یکجا کر دیں، ان میں ڈاکٹر سید احتشام حسین، علی جواد زیدی، پروفیسر عنوان چشتی وغیرہ ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے ان کی شاعری کے متعلق گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے، پروفیسر منظر امام نے ان کو سچا اور کھرا شاعر قرار دیا ہے، نثر نگاری کے باب میں مرتب اور ڈاکٹر شکیل احمد کے علاوہ مدیر معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی تحریر بھی شامل ہے، ایک جوہر قابل کے بجا اعتراف و تعارف کی یہ عمدہ مثال ہے۔

روشن لکیریں از جناب شمیم طارق، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: روزنامہ ہندوستان، مولانا آزاد روڈ، ممبئی

اخباری اداریوں میں وقتی اور ہنگامی ضرورت کے پیش نظر عموماً عصری مسائل اور روزمرہ کے واقعات سے متاثر قاری کے مزاج کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے اس لئے ان کی افادیت اور اہمیت کا دائرہ بھی محدود ہوتا ہے لیکن بعض تحریریں مطالعہ و فکر، جذبہ و احساس، اصابت رائے اور زبان و اسلوب کی خوبی کی وجہ سے زندہ و قائم رہ جاتی ہیں، اردو اخبارات و جرائد کی تاریخ ایسے متعدد نامور صحافیوں سے روشن ہے جن کی تحریروں کو بقائے دوام کا درجہ حاصل ہوا، زیر نظر کتاب میں ممبئی کے صحافی جناب شمیم طارق کے قریب چالیس ادرایوں کو جمع کیا گیا ہے، یہ وہاں کے اخبار اردو ٹائمز میں شایع ہوکر مقبول ہوئے، رشدی! ور ابلیس، مشرق وسطیٰ کے اولین اخبار، اردو کا پہلا اخبار طوق غلامی کی علامت، سعودی عرب کا قومی دن، کوئی رہزن نہ ہم سفر ہوجائے اور بندے ماترم وغیرہ عمدہ مضامین اس میں شامل ہیں، جدید اردو صحافت کے ہاتھوں کی یہ روشن لکیریں اس کی خوش بختی کی خبر دیتی ہیں۔

ع-ص-